(صرف احمدی احباب کی تعلیم وتربیت کے لئے)

نجات

موازنہ مابین (دین حق) ومسیحیت

از

افاضات

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی

بسم اللہ الرحمان الرحیم　　　　　　نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

’’عیسائیت نجات کو بالکل نہیں مانتی اور عیسائیت کفارہ کے بغیر کوئی روحانی ترقی تسلیم نہیں کرتی۔ ان دوعقیدوں سے خدا تعالیٰ کی صفت کافی اور خدا تعالیٰ کی صفت ھادی باطل ہو جاتی ہیں اور ان دونوں صفات کے باطل ہونے سے اس کا علیم اور صادق ہونا بھی باطل ہوجاتا ہے۔ گویا عیسائیت کے ان ہر دو عقائد کو مان لینے سے خدا تعالیٰ کی خدائی باطل ہو جاتی ہے اور جب کسی مذہب کی تعلیم کے نتیجہ میں خدا کی خدائی باطل ہو جائے تو ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ وہ مذہب خود باطل ہے کیونکہ مذہب خدا تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وابستہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے تثلیث بھی ایک اہم عقیدہ ہے لیکن ان کا یہ عقیدہ کفارہ اور نجات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ اگر کفارہ اور عدم نجات باطل ہو جائیں تو ساتھ ہی تثلیث بھی باطل ہو جاتی ہے اور اگر تثلیث کو الگ کر لیا جائے تو کفارہ اور عدم نجات باطل ہو جاتے ہیں چنانچہ دیکھ لو عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو نجات دلانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح کو دنیا میں کفارہ کیلئے بھیجا۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس کے عدل کے خلاف ہے اگر وہ انسان کے گناہ معاف کر دیتا تو وہ عادل نہ رہتا۔ لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ بنی نوع انسان نجات پائیں اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ وہ پھانسی پر لٹک جائے اور اس کے پھانسی پر لٹک کر مر جانے کے نتیجہ میں وہ لوگ جو اس پر ایمان لائیں روحانی سزا سے بچ جائیں اور اس کا پھانسی پر لٹک کر مر جانا لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کفارہ بغیر تثلیث کے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کفارہ کی بنیاد اس

امر پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پھانسی دی اور تین دن کے بعد اس کو زندہ کیا۔ یہ چیز تبھی تسلیم کی جاسکتی ہے جب ایک سے زیادہ خدا ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ خدا نہ ہوں تو یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو نعوذ باللہ پھانسی دے کر تین دن کے بعد اپنے آپ کو زندہ نہیں کر سکتا۔ مگر تین خداؤں کو تسلیم کرنے کی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ تینوں برابر کی طاقت رکھتے ہیں یا ان میں کم وبیش طاقت ہے اگر ایک کم طاقت رکھتا ہے اور دوسرا زیادہ۔ تو خدا تعالیٰ میں نقص ثابت ہوا اور ناقص چیز تمام مذاہب کے متفقہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہوسکتی۔ اس پر کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک منطقی نظریہ ہے کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہوسکتی اور جو ہستی ازلی ابدی نہ ہو وہ خدا نہیں ہوسکتی۔ اس پر تمام مذاہب متفق ہیں بلکہ عیسائیت کو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہوسکتی اور خدا تعالیٰ کے لئے ازلی ابدی ہونا ضروری ہے۔

میں ابھی نوجوان تھا قریباً بیس سال کی عمر تھی کہ میں تبدیلیٔ آب وہوا کے لئے ڈلہوزی گیا۔ وہاں ایک مشہور پادری آئے ہوئے تھے جن کا نام غالباً فرگوسی تھا انہوں نے سینکڑوں عیسائی بنا لئے تھے اور وہ پہاڑ پر بھی اپنے ٹریکٹ تقسیم کرتے اور عیسائیت کی تعلیم پھیلاتے رہتے تھے۔ کچھ مسلمان جو غیرت مند تھے وہ مولویوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اس فتنہ کا مقابلہ کریں مگر انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے تو مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ آخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ آپ چلیں اور ان سے بات کریں ہم لوگ بڑے شرمندہ ہیں۔ میں ابھی چھوٹی عمر کا ہی تھا اور میری دینی تعلیم ایسی نہ تھی لیکن میں ان کے کہنے پر تیار ہوگیا اور ہم چند آدمی مل کر ان کی کوٹھی کی طرف چل پڑے وہاں جا کر میں نے ان سے کہا کہ پادری صاحب میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہم میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور میرے سامنے ایک پنسل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا فرمایئے اگر یہ پنسل اٹھانے کی

ضرورت ہواور آپ اس وقت مجھے بھی آواز دیں کہ آؤاور میری مدد کرو۔ اپنے ساتھیوں کو بھی آوازیں دینی شروع کر دیں۔ اپنے بہرے کو بھی بلائیں۔ اپنے باورچی کو بھی بلائیں۔ اپنے اردگرد کے ہمسائیوں کو بھی بلائیں اور جب سارا محلّہ اکٹھا ہو جائے تو آپ ان سے یہ کہیں کہ یہ پنسل میز پر سے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دو تو وہ آپ کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ کہنے لگا اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا مطلب خود بخود آ جائے گا آپ صرف یہ بتائیں کہ آیا یہ بات معقول ہوگی اور اگر آپ ایسا کریں تو لوگ آپ کے متعلق کیا سمجھیں گے؟ کہنے لگا پاگل سمجھیں گے۔ میں نے کہا اب یہ بتایئے کہ باپ خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی۔ میں نے کہا پھر یہ وہی پنسل والی بات ہوگئی کہ تینوں میں ایک جیسی طاقت ہے اور اس کام کے کرنے کے قابل ہیں۔ مگر تینوں بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں حالانکہ وہ اکیلے اکیلے بھی دنیا کو پیدا کر سکتے تھے۔ میں نے کہا آپ یہ بتائیں کیا دنیا میں کوئی کام ایسا ہے جس کو باپ خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا نہیں کر سکتا۔ یا بیٹا خدا کر سکتا ہے اور روح القدس خدا نہیں کر سکتا۔ یا روح القدس خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا۔ یا بیٹا خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا؟ کہنے لگا کوئی نہیں۔ میں نے کہا پھر جھگڑا کیا ہے۔ اگر دو خدا فارغ بیٹھے رہتے ہیں تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ کہ وہ کام تو کر سکتے ہیں مگر فارغ بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں اور اگر ایک کام کو تینوں مل کر کرتے ہیں حالانکہ ان تینوں میں سے ہر ایک اکیلا اکیلا بھی وہ کام کر سکتا ہے تو یہ جنون کی علامت ہے۔ اس پر وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ کہ عیسائیت کی اصل بنیاد کفارہ کے مسئلہ پر ہے تثلیث کا مسئلہ تو ایمان کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ میں نے کہا جب تک تثلیث سمجھ میں نہ آئے انسان ایمان نہیں لا سکتا اور جب تک ایمان نہ لائے تثلیث سمجھ میں نہیں آ سکتی تو یہ تو دورِ تسلسل ہو گیا۔ جس کو تمام منطقی ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا آپ مجھے معاف کریں کفارے پر بات کریں۔

پس درحقیقت کفارہ تعلق رکھتا ہے تثلیث کے ساتھ ۔اگر کفارہ باطل ہو جائے تو تثلیث خود بخود باطل ہو جاتی ہے اور چونکہ یہ عقیدہ صریح مشرکانہ ہے۔۔۔۔۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں اس بات پر بڑی بحث کی ہے کہ جس چیز کا انسان عالم کامل ہوا سے وہ بنا بھی سکتا ہے مثلاً انسان کو علم ہے کہ اینٹیں جوڑنے سے مکان بن جاتا ہے تو اس علم کے نتیجہ میں وہ مکان بنا لیتا ہے یا اسے علم ہے کہ مٹی گھول کر لکڑی کے سانچوں میں ڈھالو تو کچی اینٹ بن جاتی ہے اور پھر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو پختہ ہو جاتی ہے۔تو اس علم کے نتیجہ میں وہ پختہ اینٹ بنا لیتا ہے۔اسی طرح اگر کسی کو یہ پتہ لگ جائے کہ مٹی کس طرح بنتی ہے تو مٹی بھی بنا سکتا ہے۔غرض خلق علم کے تابع ہے۔جب کسی چیز کا کامل علم حاصل ہو جائے تو اسے انسان بھی بنا سکتا ہے۔اگر کسی کو گھڑی بنانے کا پورا علم حاصل ہو جائے تو وہ گھڑی بنا لے گا۔جسے افعال الاعضاء کا پورا علم حاصل ہو جائے وہ ڈاکٹر بن جائے گا۔غرض کسی چیز کا علم کامل خلق پر قدرت دے دیتا ہے اور جب کوئی ہستی کامل علم والی ہو تو لازماً اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ کامل خلق بھی کر سکتی ہے اور کامل تدبیر بھی کر سکتی ہے اور یہ کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مدبّر کی ضرورت نہیں۔جیسے فرگوسن کے سامنے میں نے یہی دلیل پیش کی کہ جب تینوں خدا کامل ہیں تو پھر ایک کی موجودگی میں باقیوں کی کیا ضرورت ہے۔خدا باپ کو لے لو۔خدا بیٹے کو لے لو۔خدا روح القدس کو لے لو۔جب باپ خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو بیٹا خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو روح القدس خدا کر سکتا ہے تو پھر ایک خدا ہی کافی ہے باقی دو کی ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کاف میں صفت کافی کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہے بندوں کی پیدائش کے لئے بھی اور ان کے نظام کے لئے بھی اور ان کی تدبیر کے لئے بھی اس میں نہ کسی کفارہ کی ضرورت ہے اور نہ بیٹے اور روح القدس کی مدد کی ضرورت ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ باوجود خدا تعالیٰ کو کافی سمجھنے کے تم بھی تو فرشتوں کے قائل ہو۔اسی طرح تم اس دنیا میں ہواؤں کے اور بجلیوں کے اور مادہ کے قائل ہو یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہم تابع حیثیت دیتے ہیں اور تابع حیثیت اور ہوتی ہے اور برابر کی حیثیت اور ہوتی ہے۔تابع چیز ایسی ہی ہوتی ہے جیسے خادم ہوتے ہیں۔وہ خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو پس پردہ رکھنے کے لئے ایک قانون بنایا ہوا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا کوئی نیک نتیجہ نکلنا تھا اور ہمیں اس کے بدلہ میں انعامات ملنے تھے تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پس پردہ رہتی۔کیونکہ جو ظاہر چیزیں ہیں ان پر ایمان لانا کسی ثواب کا موجب نہیں ہوتا۔سورج ہمیں نظر آتا ہے اور ہم اس کا وجود مانتے ہیں مگر اس کے ماننے سے ہمیں انعام نہیں ملتا۔اسی طرح پہاڑ نظر آتے ہیں اور ہم ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر ہمیں ان پہاڑوں کے ماننے سے ثواب نہیں ملتا۔چونکہ انسانی پیدائش کی غرض تکمیلِ روحانیت تھی اور تکمیلِ روحانیت ثواب کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور روحانی نظر کی تیزی کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔اس لئے جب کسی چیز کی تیزی اور اس کے ارتقاء کا سوال آئے گا لازماً امتحان اور آزمائش کا بھی سوال آجائے گا اور امتحان اور آزمائشیں زیادہ تر اسی چیز کے متعلق ہوتی ہیں جس کے حصول میں مشکلات حائل ہوں۔پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مخفی رہے۔ورنہ بنی نوع انسان کی ترقی کی سکیم بالکل بیکار چلی جاتی اور جب خدا نے پوشیدہ رہنا تھا تو یہ لازمی بات تھی کہ کچھ روحانی سامان پیدا کئے جاتے۔روحانی اسباب میں فطرتِ صحیحہ اور فرشتے شامل ہیں اور جسمانی اسباب میں مادہ اور اس کو حرکت دینے والا قانون شامل ہے۔پس فرشتوں کا وجود یا مادہ کا وجود کسی اعتراض کا موجب نہیں۔عیسائی برابر کے خدا پیش کرتے ہیں اور ہم خادم اور تابع چیزیں پیش کرتے ہیں اور خادم اور تابع چیزوں کی ضرورت اس لئے ہے تا اللہ تعالیٰ کی ہستی وراء الوراء رہے اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسا پردہ حائل رہے جس کو مجاہدہ اور محنت سے کام لینے والا انسان ہی پھاڑ سکے، ہر انسان نہیں۔غرض علمِ مبداء اور علم موجودات

کا جو واقف ہوگا لازماً قادرِ مطلق ہوگا۔اسی طرح خدا تعالیٰ کا صادق ہونا بھی ایک مجاہد کی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔اگر انسان بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تھا تو تمام سابق انبیاء جھوٹے قرار پاتے ہیں اوران کو بھیجنے والا بھی جھوٹا قرار پاتا ہے کیونکہ آدم آیا اوراس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔نوحؑ آیا اوراس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔آدم کا واقعہ تو تورات میں تفصیل کے ساتھ موجود نہیں۔نوحؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور بائبل بتاتی ہے کہ نوحؑ نے آ کر کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔اگر انسان بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تو نوحؑ جھوٹا تھا اور نوحؑ کو بھیجنے والا بھی جھوٹا تھا۔پھر ابراہیمؑ آئے انہوں نے بھی بنی نوع انسان سے یہی کہا کہ جو صداقتیں میں پیش کرتا ہوں ان کو مانو۔گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی بائبل میں ادھورا ہے جیسے آدم کا ذکر ادھورا ہے۔لیکن اس کے بعد موسیٰؑ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔اور بائبل بتاتی ہے کہ انہوں نے دنیا کے سامنے اپنی تعلیم پیش کی اوران سے یہی کہا کہ اگر تم اس تعلیم کو نہیں مانو گے تو تم خدا تعالیٰ کے غضب کے نیچے آ جاؤ گے اوراگر مانو گے تو نجات پا جاؤ گے۔انہوں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میں تعلیم تو دیتا ہوں مگر تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔جیسے عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔موسیٰؑ نے یہی کہا کہ اگر تم عمل کرو گے تو نجات پا جاؤ گے۔پس عیسائی عقیدہ اگر سچا ہے اور نجات ناممکن ہے تو موسیٰ جھوٹا تھا اور اس نے نعوذ باللہ بڑا فریب کیا کہ اپنی تعلیم کے متعلق لوگوں سے یہ کہا کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو نجات پا جاؤ گے اوراگر وہ نبی تھا جیسے بائبل کہتی ہے کہ وہ نبی تھا تو پھر خدا بھی نعوذ باللہ جھوٹا قرار پاتا ہے جس نے اسے اس تعلیم کے ساتھ بھیجا۔اسی طرح موسیٰ کے بعد آنے والے باقی تمام انبیاء بھی جھوٹے ماننے پڑتے ہیں۔کیونکہ ہر ایک نے کہا کہ میری تعلیم پر چلو گے تو نجات پاؤ گے۔چنانچہ زبور میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ:۔

''تیری شریعت سچائی ہے'' (زبور باب ۱۱۹ آیت ۱۴۲)

اگر شریعت پر عمل نہیں ہوسکتا جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت لعنت ہے تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ سچائی پر عمل نہیں ہوسکتا صرف جھوٹ پر عمل ہوسکتا ہے اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ سچائی سے نجات نہیں مل سکتی صرف جھوٹ سے مل سکتی ہے۔ غرض اگر ہم یہ مان لیں کہ انسان شریعت پر عمل کرنے سے نجات نہیں پا سکتا اور نبیوں کی اتباع نہیں کرسکتا تو سارے انبیاء کا سلسلہ جھوٹا ماننا پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ صادق خدا ہے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نجات ہے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تمام نبیوں نے یہی کہا ہے کہ اگر تم ہماری باتوں کو مانو گے تو نجات پا جاؤ گے۔

دوسرے عربی زبان میں صدق کے لفظ میں دوام کے معنی بھی پائے جاتے ہیں خالی سچائی کے معنے نہیں۔ بلکہ وہ چیز جو قائم رہنے والی ہوتی ہے اس پر بھی صدق کا لفظ حاوی ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے صادق ہونے کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس کا وجود اور اس کی تعلیم ہمیشہ قائم رہنے والی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ خدا تعالیٰ کا قول اور خدا تعالیٰ کا فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ کا قول اور اس کا فعل تبھی قائم رہنے والے ہوسکتے ہیں جب بنی نوع انسان بھی قائم رہنے والے ہوں۔ اگر مخلوق نے نجات نہیں پانی اور ہلاک ہو جانا ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کے قول نے بھی قائم نہیں رہنا اور اس کے فعل نے بھی قائم نہیں رہنا کیونکہ اس کا قول اور اس کا فعل مخلوق کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کا قول اور فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں تو معلوم ہوا کہ انسان قائم رہے گا اور وہ نجات پا سکتا ہے۔ اگر اس نے فنا ہو جانا تھا تو خدا تعالیٰ کا ہمیشہ قائم رہنے والا قول اور فعل باطل ہو جاتا ہے۔ غرض صدقِ کامل اپنے ظلی صدق کا بھی مطالبہ کرتا ہے کیونکہ صدق دوام پر دلالت کرتا ہے اور دوامِ صفات بغیر دائمی موہبت صفات کے نہیں ہوسکتا۔ خود بائیبل بھی ہماری اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ بائیبل میں آتا ہے خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا (پیدائش باب ا

آیت ۲۶، ۲۷) اب خدا تعالیٰ کی شکل کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی نعوذ باللہ ہماری طرح ناک کان، آنکھیں اور منہ ہیں۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اندر جو صفات پائی جاتی ہیں وہ انسان کے اندر بھی پائی جا سکتی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی شکل پر بنایا گیا اور خدا تعالیٰ صادق ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر تقویٰ اور راستبازی اور طہارت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ جو صادق ہے۔ اس کا ارادہ اور فعل غلط نکلے اور انسان بوجہ گندی سرشت کے شیطان بن گیا۔ پس جو مذہب یہ کہتا ہے کہ انسان گندی سرشت کے ساتھ دنیا میں آیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ارادہ کیا مگر کوئی وجود بھی وہ اپنی شکل پر پیدا نہ کر سکا۔ اس نے آدمؑ کو اپنی شکل پر پیدا کیا لیکن وہ گناہگار ہو گیا۔ یعنی یا تو خدا تعالیٰ کی شکل ناقص ہے یا وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا اور شیطان خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پہلے پھل کو بھی لے گیا اور اس کے اگلے پھلوں کو بھی چرا کر لے گیا بلکہ اس کے آخری پھل مسیحؑ کو بھی آزمائش کے لئے آ گیا۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی ہتک نہیں اور کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی صداقت پر حرف لانے والا نہیں؟ خدا تو یہ کہتا ہے کہ میں نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا مگر ہوتا یہ ہے کہ پہلا انسان بھی شیطان کی شکل پر بن جاتا ہے یعنی اس کی بات ماننے لگ جاتا ہے اور اس کی آئندہ نسل بھی ورثہ کے گناہ میں ہمیشہ کے لئے مبتلا ہو جاتی ہے اور شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے لگ جاتی ہے حتیٰ کہ مسیحؑ جو نجات دہندہ کے طور پر آیا تھا وہ بھی اتنا کمزور ثابت ہوتا ہے کہ شیطان اس کی آزمائش کے لئے آ جاتا ہے (متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۱) مگر اس کے مقابلہ میں قرآن کریم جو تعلیم دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نجات دینے کے لئے کسی کفارہ کا محتاج نہیں۔ اس نے اپنے بندوں کو ہدایت کے لئے ہی بنایا ہے اور ان کی پیدائش میں فطری طور پر اس نے نیکی کا مادہ رکھا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں شیطان کے اس دعویٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ انسان

کوخراب کرے گا فرماتا ہے:۔

قَالَ اَرَءَ یْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗ اِلَّا قَلِیْلاً oقَالَ اذْھَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ فَاِنَّ جَھَنَّمَ جَزَآءُ کُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْراً oوَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْھُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْھِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْھُمْ فِیْ الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْھُمْ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْراً oاِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفیٰ بِرَبِّکَ وَکِیْلاًoرَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِیْ الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ اِنَّہٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْماً۔(بنی اسرائیل آیت ۶۳ تا ۶۶)

یعنی جب آدمؑ پیدا ہوئے اوران کی عدم اطاعت اور نافرمانی کی وجہ سے شیطان پر غضب نازل ہوا تو اس نے کہا یہ آدمی جس کو مجھ پر فضیلت بخشی گئی ہے۔اس کے مقابلہ میں اگر آپ مجھے قیامت تک موقعہ دیں۔تو میں اس کی اولاد پر غالب آجاؤں گا سوائے کچھ لوگوں کے۔اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کے رو سے (یہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ کہہ دیں یہ غلط بات ہے) شیطان بھی یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ سارے انسان خراب ہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور شیطان نے بھی یہ جرأت نہیں کی کہ سب کو خراب قرار دے بلکہ اس نے تسلیم کیا کہ کچھ انسان پھر بھی بچ جائیں گے لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗ اِلَّا قَلِیْلاً نہایت واضح آیت ہے اور بتا رہی ہے کہ یہ مسئلہ اتنا غلط ہے کہ شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوسکی کہ وہ کہے کہ ہر انسان خراب ہے۔وہ بھی اقرار کرتا ہے کہ کچھ انسان میرے حملہ سے ضرور بچ جائیں گے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایااِذْھَبْ فَمَنْ تَبِعَکَ مِنْھُمْ فَاِنَّ جَھَنَّمَ جَزَآؤُ کُمْ جَزَآءً مَوْفُوْراً ۔جاؤان میں سے جو اپنی مرضی سے تمہارے پیچھے چلے گا اس کو سزا دی جائے گی اور تو ان کو ڈرایا بلا جس کو چاہے اپنی آواز سے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے لے جا اور ان کو

اموال اور اولاد میں شریک کر اور انہیں وعدے دے وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْراً اور شیطان تو ہمیشہ جھوٹے وعدے دیا کرتا ہے ۔اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ۔ لیکن یہ بتا دیتا ہوں کہ تو نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں بندوں کو چھین کر لے جاؤں گا مگر میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص میری طرف آنا چاہے گا تو اسے کبھی اپنی طرف نہیں لے جا سکے گا۔وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلاً اور وہ انسان جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اس سے زیادہ حفاظت میں اور کون ہو سکتا ہے رَبُّكُمُ الَّذِیْ يُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْماً۔ اور تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کشتی کو آرام سے سمندر میں لے جاتا ہے تا کہ تم اس کے فضل کی تلاش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسانی فطرت پاک ہے تو پھر یقیناً اس کو بدی پر غالب آنے کی طاقت بھی حاصل ہے اور اگر انسان بدی پر غالب آ سکتا ہے تو پھر کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی ۔ بلکہ صحیح فطرت کی کوشش اور توبہ اور اس کے نتیجہ میں خدا کا رحم نجات کے لئے کافی ہے ۔ چنانچہ ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

اوّل:۔شیطان نے یہ امید ظاہر کی ہے۔ کہ وہ اکثر بنی نوع انسان کو اپنے قابو میں لے آئے گا۔ گویا قرآن کریم بنی نوع انسان کی خرابی کے عقیدہ کو شیطان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہی نہیں کہ (دین حق) اس کو ردّ کرتا ہے۔ ردّ کرنا اور چیز ہوتی ہے اور کسی عقیدہ کو اتنا گندہ قرار دینا کہ اس کو شیطانی فعل کہنا بالکل اور بات ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کے متعلق قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ شیطان کا عقیدہ ہے اور شیطان کے متعلق بھی فرماتا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ سارے انسان خراب ہو جائیں بلکہ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اکثر انسانوں کو میں خراب کر لوں گا۔ دوسری بات قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کہا کہ تم کوشش کرو۔

ہم تمہیں روکتے نہیں۔ہم نے انسان کو بنایا ہی اس لئے ہے کہ وہ تمہارا مقابلہ کرے اور اپنے اندر نیکی پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن فرماتا ہے تم صرف بیرونی اثرات سے ہی اس پر اپنا اثر ڈال سکو گے ورنہ فطرتاً ہم نے اسے پاک بنایا ہے۔عیسائیت تو یہ کہتی ہے کہ گناہ انسان کے دل میں گھس گیا اور ورثہ کے طور پر نسلِ انسانی میں چل پڑا۔حالانکہ اگر یہ درست ہے تو شیطان کے پیچھے چلنے کی تحریک خود انسان کے دل سے پیدا ہونی چاہیئے۔لیکن (دینِ حق) اس کے دل کو پاک قرار دیتا ہے۔بلکہ اس انسان کے دل کو بھی پاک قرار دیتا ہے جو شیطان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔فرماتا ہے:۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ۔یعنی جس کو چاہے تو اپنی آواز سے ورغلانے کی کوشش کر اور جس پر چاہے اپنے گھوڑے چڑھا کرلے جا یعنی اپنے لاؤلشکر اس پر لے جا اور جس پر چاہے اپنے پیادے لے جا یعنی خواہ جو غالب لوگ ہیں ان کے ذریعہ ان کو ورغلایا جو ماتحت ہیں ان کے ذریعہ ورغلا اور خواہ تو انہیں مال کی لالچ دے یا اولاد کی ترقی کی لالچ دے میرے بندوں پر تیرا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس آیت میں بنی نوع انسان کو خراب کرنے والی جن تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو دل سے پیدا ہوتی ہو بلکہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو باہر سے آتی ہیں اور انسان کو خراب کر دیتی ہیں مثلاً فرمایا کہ تم گانے بجانے سے انسان کو خراب کرو گے۔تم دھمکیوں سے اسے خراب کرو گے یعنی یہ کہ اگر سچ بولا تو پھانسی پر لٹک جاؤ گے یا تم نے سچ بولا تو قید ہو جاؤ گے۔پھر فرمایا **وشارکھم فی الاموال** تم اس کو لالچیں دو گے کہ اگر تم نے حرام مال نہ کھایا تو ہمیشہ غریب رہو گے۔اگر تم نے ترقی کرنی ہے تو حرام مال کھاؤ **والاولاد**۔اسی طرح جتھے بنانے کے لئے اور پارٹی بازی کے لئے تم اسے اکساؤ گے

اور کہو گے کہ جب تک تم فریب نہ کرو گے کامیاب نہیں ہوسکو گے **وعدھم** اور پھر ہر قسم کی ترقیات کے وعدے دو گے اگر تم جھوٹ اور فریب اور مکر اور دغا بازی سے کام لو گے تو خوب ترقی کرو گے۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو خارجی ہیں۔ اگر انسان کا دل ناپاک تھا تو پھر ان چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اللہ تعالیٰ فرما دیتا کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان گناہگار ہوگیا۔ مگر جتنی چیزیں قرآن کریم نے انسان کو بگاڑنے اور خرابی میں مبتلا کرنے والی بیان کی ہیں وہ ساری کی ساری ایسی ہیں یعنی (۱) گانا بجانا (۲) دھمکیاں۔ مثلاً یہی کہ کہیں انبیاء کے ماننے والے ترقی نہ کر جائیں اس لئے ان پر خوب ظلم کرو (۳) حرص اور لالچ۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی خرابی کے لئے تمہیں بیرونی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اندرونی طور پر وہ محفوظ ہے۔ مگر ورثہ کا گناہ اندر سے پیدا ہوتا ہے باہر سے نہیں آتا۔ جیسے کسی شخص کی والدہ کو سل کا مرض ہو اور وہ بچپن میں اپنی والدہ کا دودھ پیتا رہا ہو جس سے سل کا مادہ اس کے اندر داخل ہوگیا ہو تو ایسے شخص کو جب سل کا مرض ہوگا تو یہ اس کی اندرونی بیماری کہلائے گی لیکن ایک اور انسان ایسا ہوتا ہے جو کسی مسلول کی تیمارداری میں مشغول رہا اور اس کے کپڑوں اور سانس وغیرہ کے ذریعہ سے سل کے کیڑے اس کے اندر چلے گئے اور وہ بیمار ہوگیا۔ اب گو سل کا مرض اس کو بھی ہوا مگر اس کی بیماری باہر سے آئی ہے اور اُس کی بیماری اندر سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح اور کئی بیماریاں ہیں جو ماں باپ سے ورثہ میں اولاد کو ملتی ہیں۔ مثلاً مرگی کا مرض ہے۔ عموماً جن بچوں کے ماں باپ کو مرگی ہوتی ہے انہیں بھی مرگی کے دورے شروع ہو جاتے ہیں۔ یا جنون ہے یہ بھی ورثہ میں چلتا ہے۔ ہم نے بعض دفعہ تین تین پشتوں میں جنون کا مرض منتقل ہوتے دیکھا ہے۔ چونکہ انسان زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے اس بارہ میں لمبا تجربہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن ممکن ہے اگر سوسائٹی بن جائے اور وہ اس کی تحقیق کرے تو شاید سات سات آٹھ آٹھ

پشتوں تک یہ مرض ظاہر ہوتی چلی جائے۔آتشک کی ایک صورت تو یقیناً ایسی ہے جو سات سات پشتوں تک چلی جاتی ہے بلکہ یورپ کے تازہ لٹریچر میں مَیں نے پڑھا ہے کہ بعض دفعہ پندرہ پندرہ بیس بیس پشت تک بھی اس مرض کے نشان ملتے ہیں گو اس کی شکل اس شکل سے بدل جاتی ہے جو ابتدائی حالت میں مرض کی ہوتی ہے لیکن بہر حال آئندہ نسل میں یہ مرض چلتی چلی جاتی ہے اب یہ مرض کہیں باہر سے نہیں آتی خود انسان کے اندر اس مرض کا مادہ ہوتا ہے۔ جب نفس پر ضعف اور کمزوری غالب آتی ہے تو کبھی ناک کی ہڈی بیٹھنی شروع ہو جائے گی اور کبھی کوئی اور علامت ظاہر ہو جائے گی جس سے معلوم ہوگا کہ آتشک کا مادہ اس کے اندر تھا لیکن اگر یہ مرض باہر سے آئے ۔مثلاً فرض کرو باپ کو آتشک نہیں تھی لیکن بچہ آگے آتشک والے مریض سے چھو گیا اور ایسی طرز پر چھوا کہ اسے آتشک ہوگئی تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ مرض اسے باپ سے ملی ہے بلکہ ہم کہیں گے کہ یہ مرض باہر سے آئی ہے۔اسی طرح قرآن کریم نے یہاں بگاڑنے کے جتنے ذرائع بتائے ہیں۔وہ سب کے سب خارجی ہیں۔یہ نہیں کہا کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان کو تم خراب کرلو گے بلکہ فرمایا کہ تم اسے لالچیں دو گے۔اس کے اندر ڈر اور خوف پیدا کرو گے۔اسے گانے بجانے کی طرف توجہ دلاؤ گے اور اس طرح تم اسے خراب کردو گے گویا خرابی کے تمام اسباب خارجی ہوں گے اندرونی نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بیان فرمائی ہے جس میں صاف طور پر ان معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو میں نے مقطعات میں ك کے بیان کئے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ جو میرے ساتھ تعلق رکھنے والے بندے ہیں ان پر تیرا قبضہ کبھی نہیں ہوسکتا اور نہ ان پر لالچ اور ڈر اور خوف وغیرہ کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلاً ۔اور تیرا رب اپنے بندے کا وکیل یعنی نگران ہونے کے لحاظ سے کافی ہے۔جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے گا تو شیطان اس پر قبضہ نہیں کر

سکتا۔ کیونکہ وہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہاں کفٰی کا لفظ استعمال کر کے صاف طور پر ان معنوں کی طرف اشارہ کر دیا جو میں نے بیان کئے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ لکَ اس جگہ کافی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ظاہر کر دی اور کفٰی کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ اس سورۃ میں خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا ذکر ہے۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر کارساز ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوتا ہے اور شیطان اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اگر ورثہ کے گناہ کی وجہ سے ہر انسان پیدائشی طور پر ناپاک ہوتا۔ جیسے عیسائی کہتے ہیں تو ایسے لوگ خواہ تقویٰ اختیار کرتے۔ خواہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ضرور تباہ ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوتا جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ گناہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ۔فطرت اپنی ذات میں پاکیزہ ہے۔ آگے اس کی دلیل دیتا ہے اور فرماتا ہے رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ اِنَّہٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْماً۔ تم گناہ کو ایک خطرناک طوفان سمجھتے ہو۔ ایک ایسی آفت خیال کرتے ہو جو تباہ کر دینے والی ہوتی ہے اور تم گناہ کو دیکھ کر سمجھتے ہو کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس نے انسان کے اندر ڈیرہ ڈال لیا ہے اور اب یہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ مگر فرماتا ہے گناہ اپنی ذات میں کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ سارا وہم ہے۔ اس کی موٹی مثال سمندر ہے تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں۔ دخانی کشتیاں تو اب بھی چلتی ہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں سودے لے جاتی ہیں لیکن پہلے زمانہ میں بادبانی کشتیوں کا رواج تھا جو ہوا کے زور پر چلتی تھیں۔ فرماتا ہے کشتیوں کا انحصار ہی ہوا پر ہے۔ لیکن کبھی ہوا طوفان بھی بن جاتی ہے۔ جب وہ حد سے بڑھ جاتی ہے تو طوفان کہلاتی ہے لیکن باوجود اس کے کبھی کبھی ہوا طوفان بن جاتی ہے۔ جب دنیا میں ہواؤں سے کشتیاں چلا کرتی تھیں۔ اگر دنیا سے کہا جاتا کہ ہوائیں بند کی جائیں یا طوفان بند کئے جائیں تو ساری دنیا پکار اٹھتی کہ

طوفان کا کیا ہے یہ تو کبھی کبھی آتا ہے۔اگر ہوائیں بند ہوگئیں تو ہماری تجارتیں ماری جائیں گی۔اور ہماری روزی کا سامان جاتا رہے گا۔اگر طوفان کے نتیجہ میں ہزاروں کشتیوں میں سے کوئی ایک ڈوب بھی جاتی تو کیا ہوا یہ مثال بیان فرما کر اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ تم گناہ گناہ کرتے ہو حالانکہ وہ تو ایک اعتداء کا نام ہے جس طرح وہی ہوا جہازوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے۔بعض دفعہ طوفان بن جاتی ہے اسی طرح وہی قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے اس کے اندر رکھی گئی ہیں جب بگڑ جاتی ہیں تو انہی کا نام گناہ بن جاتا ہے۔گویا گناہ ایک طوفان ہے جذبات کا۔مگر طوفان ہوا کے حد سے بڑھنے کا نام ہوتا ہے اس کے نیچے اس کی سب حرکت نیک ہوتی اور نیک نتائج پیدا کرتی ہے۔مثلاً انسان کو خدا تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں جن سے وہ دن رات کام لیتا ہے۔ایک بدمعاش سے بدمعاش انسان کے بھی سارے دن کے اعمال کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آنکھوں کا کتنا ناجائز استعمال کیا ہے تو پتہ لگے گا کہ دوسو دفعہ اس نے اپنی آنکھوں کا جائز استعمال کیا ہے اور 1/200 دفعہ ناجائز استعمال کیا ہے کہیں اس نے گھر کی صفائی کی ہوگی۔کہیں اس نے دوستوں سے ملاقات کی ہوگی۔کہیں اس نے محنت اور مزدوری کی ہوگی اور یہ سارے کام اس نے آنکھ سے کئے ہوں گے جو آنکھوں کا جائز استعمال ہے۔لیکن ایک دفعہ اس نے کسی غیر عورت کو بھی دیکھ لیا ہوگا۔اگر اس کی آنکھ ماری جاتی تو بیشک ناجائز فعل اس سے نہ ہوتا۔مگر جائز فعل بھی وہ نہ کرسکتا پس فرماتا ہے۔گناہ کی تعریف جو تم نے سمجھی ہے وہ غلط ہے۔تم گناہ کو اپنی ذات میں بری چیز سمجھتے ہو حالانکہ وہ قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں انہی میں افراط اور تفریط کا نام گناہ ہو جاتا ہے۔مثلاً اسراف صدقہ کی زیادتی کا نام ہے اور بخل مال کی حفاظت میں شدت پکڑنے کا نام ہے۔اور صدقہ اور حفاظتِ مال کے بغیر دنیا چل ہی نہیں

سکتی۔ اسی طرح زنا رجولیت کے بے موقعہ استعمال کا نام ہے اور رہبانیت اس کے عدم استعمال کا نام ہے اگر رجولیت کا استعمال نہ ہوتو دنیا کیونکر چلے اور اگر اس پر ضبط نہ رکھا جائے تو انسان کی صحت کس طرح قائم رہے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہ کا فلسفہ بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ انسان کی پیدائش نیک ہے بدی باہر سے آتی ہے اور یہ دعویٰ کہ انسان کی اکثریت گناہ میں مبتلا ہوگی ایک شیطانی خیال ہے۔

(۲) دوسری آیت جو اس مضمون کو واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْم. ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ. اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْن ۔(التین ۔۵تا۷)

فرماتا ہے ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوتیں دے کر پیدا کیا ہے **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْن** مگر اس کے بعد ہم اس کو بعض دفعہ نیچے ہی نیچے لے جاتے ہیں۔ یہاں ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ پہلے آدمؑ آیا اور اس نے ترقی کی مگر اس کے گناہ کی وجہ سے نسلِ انسانی گر گئی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ** ۔ **اَسْفَلَ سَافِلِيْن** میں سارے انسان نہیں جاتے بلکہ وہ حصہ جو **اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰت** والا تھا وہ تو **اَحْسَنِ تَقْوِيْم** پر قائم رہا۔ صرف دوسرا حصہ جس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تھا وہ سزا میں مبتلا ہوا اور نبیوں کی جماعت سے الگ ہوگیا۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ** میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ نبیوں کی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں اور ان کی نیکی بھی کسبی ہے اور گناہ بھی کسبی ہے۔ نہ نیکی ورثہ کی ہے نہ گناہ ورثہ کا ہے۔ اور عیسائیوں سے ہماری بحث ہی یہی ہے کہ تم بتاؤ آیا نبیوں کی جماعتیں بھی کفارہ پر ایمان لائے بغیر بچ سکتی ہیں یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ بلکہ قرآن کہتا

ہے کہ مومن اور عمل صالح کرنے والوں یعنی نبی کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والے لوگوں کے لئے ایک غیر مقطوع اجر ہوگا۔پس یہ خیال کہ گناہ انسان کی پیدائش میں رکھا گیا ہے۔بالکل غلط ہے۔

یہاں عیسائی اعتراض کر سکتے ہیں کہ ہمارا تو یہی دعویٰ ہے۔کہ انسان کی فطرت میں چونکہ بدی ہے وہ نیک عمل کر ہی نہیں سکتا اور اسی لئے ہم شریعت کو لعنت قرار دیتے ہیں۔اس کا جواب قرآن کریم مندرجہ ذیل آیت میں دیتا ہے فرمایا:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰ ھَا .فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا .قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰھَا .وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔(الشّمس آیت ۸تا۱۱)

ہم شھادت کے طور پر نفس انسانی کو اور اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ قوتوں کے ساتھ پیدا کرنے کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔**سوّٰی** کے معنی ہوتے ہیں جس میں کوئی کجی نہ ہو اور تسویہ کے معنی ہوتے ہیں برابر کر دینا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔**ونفسٍ وما سوّٰھا** میں **ما** مصدریہ ہے اور اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم شھادت کے طور پر پیش کرتے ہیں نفس کو اور اس کے بغیر افراط وتفریط کے اعلیٰ درجہ کی قوتوں کے ساتھ پیدا کیے جانے کو۔فالھمھا فجورھا وتقوٰ ھا۔جب ہم نے اسے پیدا کر دیا تو اس کے بعد ہم نے اس نفس کو الہام کیا **فجورھا وتقوٰھا** کہ فجور کیا ہے یعنی کن باتوں سے تو رستہ سے ادھر اُدھر ہو سکتا ہے **وتقوٰھا** اور کون سے ایسے راستے ہیں جن پر چل کر تو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اس آیت سے ایک تو یہ پتہ لگا کہ اللہ تعالیٰ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسانی نفس میں تسویہ پایا جاتا ہے کجی نہیں پائی جاتی۔نیکی پائی جاتی ہے بدی نہیں پائی جاتی۔

دوسرے نہ صرف اپنی ذات میں اس میں درستی پائی جاتی ہے بلکہ اس میں نیکی اور بدی کا ایک احساس بھی پایا جاتا ہے یعنی ہم نے اس کے اندر ایک کانشنس رکھی ہے جو پہچانتی

ہے کہ کونسا اچھا راستہ ہے اور کونسا برا۔ مثلاً ایک سوٹی جسے چھیل کر صاف کر لیا گیا ہو اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میں صاف ہوں۔ لیکن انسان کو پتہ ہوتا ہے کہ میرے اندر فلاں خوبی پائی جاتی ہے یا مثلاً یوں سمجھ لو کہ ایک انسان جس کی جیب میں روپیہ ہو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آدمی بے پیسہ کے نہیں لیکن اگر اس کو پتہ نہیں کہ میری جیب میں روپیہ پڑا ہوا ہے تو وہ اس کو استعمال نہیں کر سکے گا۔

یہاں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ ہم نے انسان کو ہر قسم کی کجی سے پاک بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ صرف پاک ہی نہیں بنایا۔ بلکہ اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تیرے اندر یہ یہ باتیں خرابی کی ہوں گی اور یہ یہ باتیں نیکی کی ہوں گی۔ گویا وہ صرف پاک ہی نہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ میرے اندر جو قوتیں پائی جاتی ہیں میں نے ان کو اس اس طرح استعمال کرنا ہے۔ اور اس کے اندر ایک کانشنس ہے جو پہچانتی ہے کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرا یہ فعل بدی ہوگا اور اگر اُس طرح کیا تو میرا فعل نیکی ہوگا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کی آیت میں مضمون کو اور بھی واضح کر دیا۔ کہ وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اس کو پاک رکھا یعنی اس کے اندر خدا تعالیٰ نے خرابیاں پیدا نہیں کیں۔ پس جو شخص اس کے تزکیہ کو قائم رکھتا ہے اور اسے خراب نہیں ہونے دیتا وہ بڑا کامیاب انسان ہے۔ وقد خاب من دسّٰھا۔ اور جو اس کی پاکیزگی کو مسل ڈالتا اور اُس کی نیکی کو اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا ہے وہ سخت ناکام اور نامراد ہوگا۔

(۴) پھر فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى. اَلَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى. وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى. وَالَّذِىْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى. فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى. سَنُقْرِئُكَ فَلاَ تَنْسٰى. اِلَّامَاشَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى. وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى. فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى. سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى. وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى. الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى۔ (سورۃ الاعلیٰ ۲ تا ۱۳)

یعنی اے انسان تو اپنے اعلیٰ رب کی تسبیح کر۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تیرا رب اعلیٰ ہے۔اس کے جواب میں فرماتا ہے **الذی خلق فسویٰ** اس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اسے ہر قسم کے عیب سے پاک بنایا **والذی قدر فھدیٰ** پھر اس نے انسان کی طاقتوں کا ایک معیار مقرر کیا کہ اس حد تک انسان ترقی کرسکتا ہے **فھدیٰ** اور پھر بتایا کہ اس اس مقام تک پہنچنے کی یہ یہ ترکیب ہے۔یعنی اگر ادنیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ تدبیر ہے۔اعلیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ کام کرو۔شہید اور صدیق بننا چاہتے ہو تو اس اس طرح کرو یا گویا **قدر فھدیٰ** میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے مختلف روحانی گریڈ مقرر کر کے ساتھ ہی طریقے بھی بتا دیئے کہ اس اس طرح عمل کرو گے تو ان گریڈوں کو حاصل کرلو گے۔

درحقیقت **الذی خلق** کے معنے **الذی خلق الانسان** کے ہیں۔کیونکہ آگے ساری باتیں وہ بیان کی گئی ہیں جو انسان سے تعلق رکھتی ہیں۔مثلاً ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ واضح بات ہے کہ ہدایت درختوں کے لئے نہیں ہوتی۔جانوروں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔پس فرماتا ہے تم اپنے اندازہ سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ کا قانون انسان کے متعلق کیا ہے اور دوسری مخلوق کے متعلق کیا ہے۔تم کھیتیوں اور سبزیوں ترکاریوں کو دیکھو **والذی اخرج المرعیٰ فجعلہٗ غثاءً احویٰ**۔تمہیں دکھائی دے گا کہ ایک وقت کے بعد وہ بالکل بے کار اور سیاہ ہو جاتی ہیں اور ان کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔لیکن اس کے مقابلہ میں انسان آتا ہے تو انسانوں کی اچھی چیزیں یعنی ان کا مغز اور روحانیت قائم رہتی ہے۔پچھلے سال کے پھل سے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔لیکن آدم کی تعلیم آج تک قائم ہے نوحؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے۔ابراہیمؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے موسیٰؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے۔معلوم ہوا کہ اس جگہ اور قانون ہے اور اس جگہ اور قانون ہے۔اگر یہ گندی چیز ہوتی تو اس کے قائم رکھنے کے معنے کیا تھے اور ضرورت کیا تھی کہ اسے ہزاروں

سال تک زندہ رکھا جاتا؟ پھر فرماتا ہے سنقرئنک فلاتنسیٰ ۔آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی تعلیم کے متعلق تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا پتہ انہوں نے یہی تعلیم دی تھی یا کچھ اور دی تھی اب ہم تجھے بتاتے ہیں کہ **سنقرئك فلا تنسیٰ** ۔ہم تجھ کو ایک سبق پڑھائیں گے جو تو کبھی نہیں بھولے گا **الا ماشاء الله** سوائے اس کے کہ کسی حکم کے متعلق خدا تعالیٰ خود کہہ دے کہ یہ عارضی ہے اور اسے بعد میں منسوخ کر دے جیسے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی تھی لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیدیا اس قسم کے عارضی احکام کے سوا ہم تجھ کو ایک ایسی تعلیم دینے والے ہیں **فلا تنسیٰ** جسے تو بھولے گا نہیں ۔اس جگہ مخاطب صرف رسول کریم ﷺ نہیں ۔ بلکہ تمام انسان مخاطب ہیں ۔اور اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ انسان جتنا بھی زور لگالے اس تعلیم کو تو بھلا نہیں سکتا۔یعنی ہم اسے قائم رکھیں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں انسان کے مخفی سے مخفی خیالات کا بھی ذکر ہے اور ان بیرونی حوادث کا بھی ذکر ہے جو اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں **ونیسرك للیسریٰ** اور ہم اس تعلیم کے پھیلانے میں تمہارے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور یہ تعلیم پھیلتی چلی جائے گی ۔اگر شریعت لعنت ہے تو ہم ایک تعلیم بھیجنے والے ہیں ہم دیکھیں گے کہ اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں فذکر ان نفعت الذکریٰ ۔ یہ جو ہم نے دلیلیں دی ہیں ان سے پتہ لگتا ہے کہ انسانی قلوب کی اصلاح شریعت اور اس سے متعلقہ چیزوں سے ہو جاتی ہے پس انہی طریقوں کو تم بھی استعمال کرو۔**سیذکر من یخشیٰ** جب تم اس تعلیم کو پیش کرو گے تو جو لوگ اپنے دل میں خوف خدا رکھنے والے ہوں گے وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھالیں گے۔اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نیکی ورثہ کی چیز ہے نہ کہ بدی ۔ کیونکہ خشیت دل میں پیدا ہوتی ہے **ویتجنبھا الاشقی** اور اس سے وہ شخص بچنے کی کوشش کرے گا جو اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال چکا ہو۔آیت کا یہ دوسرا حصہ بھی بتاتا ہے کہ شقاوت خود انسان کی پیدا

کردہ ہوتی ہے ورنہ ہر انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پاک ہے۔

(۵) پھر فرماتا ہے **اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ** (سورۃ البلد ۹ تا ۱۱)

کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے آنکھیں دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان گنہگار ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان نے گناہ کو ورثہ میں لیا ہے کیا ہم نے اسے آنکھیں نہیں دیں۔ کیا ہم نے اسے زبان نہیں دی۔ کیا ہم نے اسے ہونٹ نہیں دیئے اگر انسان فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کی نجات کفارہ پر ہی منحصر تھی تو ہم نے اسے آنکھیں کیوں دی تھیں اور وہ دیکھتا کیوں ہے اور اگر اس کا دل گندا تھا اور وہ کسی واقف انسان سے تبادلۂ خیالات کر کے اپنے گند کو دور نہیں کر سکتا تھا تو ہم نے اسے زبان کیوں دی تھی اور اس کے ہونٹ کیوں بنائے تھے وھدینٰہ النجدین۔ پھر ہر انسان کے اندر خدا تعالیٰ نے ایک کانشنس رکھی ہے جو نیکی اور بدی کا موازنہ کرتی ہے۔ اگر یہ نیکی اور بدی کا موازنہ کر ہی نہیں سکتا تو اس کانشنس کی کیا ضرورت تھی۔ کفارہ تو ایسا ہی ہے جیسے گڑھے میں پتھر ڈال کر کوئی شخص سمجھ لے کہ اس کا پیٹ بھر جائے گا۔ چیز وہ ہوتی ہے جس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہو۔ جب اس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہی نہیں اور انسان دیکھتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں تو اسے سوچنا چاہیئے کہ پھر اس کی ضرورت کیا ہے۔ اگر کفارہ پر ہی بنی نوع انسان کی نجات منحصر تھی تو کیا ضرورت تھی آنکھ کی۔ کیا ضرورت تھی زبان کی۔ کیا ضرورت تھی ہونٹوں کی۔ اس کے بعد فرماتا ہے **وھدینٰہ النجدین** پھر ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیئے۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض دفعہ چھوٹے سے چھوٹے لفظ میں بڑی بھاری بات بیان کر دیتا ہے۔ قرآن کریم میں رستہ کا ذکر کئی دوسرے مقامات پر بھی آتا ہے مگر کسی جگہ اس کے لئے سبیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کسی جگہ طریق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہاں

اللہ تعالیٰ نے نجد کا لفظ استعمال کیا ہے ۔سبیل اور طریق کے الفاظ چھوڑ دیئے ہیں ۔اس اختلاف سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں کے مضمون کے ساتھ نجد کا ہی تعلق ہے سبیل اور طریق کا نہیں ۔ہم دیکھتے ہیں کہ لغت میں نجد کے معنے اونچے راستے کے ہیں جو چڑھائی والا ہو۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ یہ مضمون بیان کیا ہے کہ چڑھائی والے راستہ پر جب انسان چلتا ہے تو اسے تکلیف ہوتی ہے ۔سانس پھولتا ہے اور اس کے پاؤں وغیرہ میں کھلّیاں پڑ جاتی ہیں ۔اسی حالت کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ یہ تو سیدھی بات ہے کہ جیسے **فلا اقتحم العقبة** میں تشریح کردی گئی ہے اس سے دنیوی رستہ مراد نہیں۔ کیونکہ آگے یہ مضمون آتا ہے کہ اس نے صدقہ نہیں دیا۔ خیرات نہیں کی ۔ یتامیٰ اور مسکین کا خیال نہیں رکھا۔ پس صاف پتہ لگتا ہے کہ اس جگہ ظاہری رستہ مراد نہیں۔ بلکہ دو راستوں سے مراد نیکی اور بدی کا رستہ ہے ۔قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کے اندر ورثہ سے آجائے اس کے لئے اسے محنت نہیں کرنی پڑتی ۔مثلاً آنکھیں ہیں یہ ہمیں ورثہ میں ملی ہیں ان میں ہمارا کوئی دخل نہیں ۔اس لئے آنکھوں سے دیکھنے کے لئے ہمیں نہ کسی مشق کی ضرورت ہوتی ہے نہ محنت اور جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ ہی آپ ہم دیکھنے لگ جاتے ہیں اسی طرح زبان ہمیں ورثہ میں ملی ہے اور ہم آپ ہی آپ بولنے لگ جاتے ہیں یا ہاتھ اور پاؤں ہیں یہ بھی آپ ہی آپ چلنے لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہمیں ورثہ کے طور پر ملے ہیں ۔اگر گناہ بھی ورثہ میں ملا ہوتا۔ تو اس کے لئے کسی مشق کی ضرورت نہیں تھی اور گناہ کا راستہ چڑھائی والا راستہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ جیسے ہاتھ اور پاؤں ہمیں ورثہ میں ملے ہیں ۔ہم نے اپنے ماں باپ سے لئے ۔انہوں نے اپنے ماں باپ سے لئے ۔نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے ہلانے جلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔اسی طرح گناہ بھی اگر ورثہ میں ملا ہے تو اس کے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیئے تھی ۔ کیونکہ وہ طاقتیں جو ورثہ کے ساتھ آتی ہیں ان کے استعمال میں انسان کو محنت نہیں

کرنی پڑتی ۔لیکن فرماتا ہے ہم نے نجدین بنائے ہیں ۔یعنی اگر تم نیکی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر تم بدی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی ۔پس نہ نیکی ورثہ میں ملی ہے نہ بدی ورثہ میں ملی ہے ۔دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔گویا ہر چیز Self acquired ہے۔بدی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑے گی ۔نیکی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑے گی ۔اگر گناہ ورثہ میں ملا ہوتا تو پہلے جھوٹ اور پہلی چوری کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑتی ۔مگر جب کوئی پہلا جھوٹ بولتا ہے تو اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب کوئی پہلی چوری کرتا ہے وہ آپ ہی بھاگا پھرتا ہے اور بعض دفعہ تو ایسی حرکات کرتا ہے کہ لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ ایک برہمن سے گائے ماری گئی ۔اس زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر برہمن گائے مارے تو اسے قتل کر دیا جائے ۔وہ گائے کو اپنے مکان میں ہی بند کر کے بھاگا ۔راستہ میں وہ جب بھی دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتا ۔فوراً ان کے پاس پہنچتا اور کہتا کہ آپ گائے گائے کیا کہہ رہے ہیں وہ کہتے کہ ہم تو گائے کا کوئی ذکر نہیں کر رہے ۔وہ کہتا کہ نہیں نہیں تم مجھ سے چھپاتے ہو ۔ضرور تم گائے کا ذکر کر رہے ہو ۔ پھر آگے چلتا اور جب پھر دو تین آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتا تو ان کے پاس پہنچتا اور کہتا یہ آپ ''بچھڑا بچھڑا'' کیا کہہ رہے ہیں ۔وہ کہتے ہم تو کوئی ذکر نہیں کر رہے ۔وہ کہتا نہیں کوئی بات ضرور ہے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی بازار ختم نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کو شبہ پڑ گیا اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔گھر گئے تو مری ہوئی گائے نکل آئی ۔تو جب انسان کسی قسم کا بھی گناہ کرتا ہے پہلی مرتبہ اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے اور وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ چور چوری کرنے کے بعد گھبرایا پھرتا ہے ۔ڈاکو ڈاکہ مارنے کے بعد گھبرایا پھرتا ہے ۔اگر گناہ ورثہ میں آیا ہوتا تو گناہ کا راستہ نجد کیوں ہوتا اور اس کے لئے چڑھائی کیوں چڑھنی پڑتی

(۶) پھر فرماتا ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ ۔۵۱)
حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی طاقت کے مطابق قوتیں دی ہیں اور پھر یہ بتایا ہے کہ وہ اس اس طرح ترقی کر سکتی ہے اس جگہ کل شئی خلقہ میں انسان کی خلق بھی شامل ہے اور بائبل خود مانتی ہے کہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کا خدا سے تعلق ہو۔اور وہی انسان مبارک ہے جو اس کے احکام کو سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے (امثال باب ۸ آیت ۳۴)

(۷) اسی طرح فرماتا ہے وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا وَلٰکِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (سجدہ ۱۴)
اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اسکی ہدایت دے دیتے اس جگہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون پہلی آیتوں کے مضمون کے خلاف ہے لیکن حقیقتاً خلاف نہیں ۔اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ولو شئنا لھدینا کل نفسٍ ۔اگر یہ الفاظ ہوتے تب بھی اس کا مضمون پہلے مضامین کے خلاف نہ ہوتا۔لیکن یہاں ھدٰھا کے الفاظ ہیں یعنی ہر نفس جو ہم نے پیدا کیا ہے اس کے اندر اس کی ہدایت کا بھی سامان رکھا ہے ۔بعض لوگ اس ہدایت کو نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو مجبور کر کے انہیں ہدایت واپس دے دیتے ۔مگر جبر سے چونکہ پیدائش انسانی کی غرض باطل ہو جاتی تھی اس لئے ہم نے جبر نہیں کیا۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا نفس پاک پیدا کیا گیا ہے اور ہر انسان ہدایت کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ۔لیکن بعض لوگ اپنی حماقت اور بیوقوفی سے اپنے اندر سے ہدایت نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں ۔فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو ان کے نفس کی اندرونی ہدایت انہیں پھر واپس دے دیتے یعنی ان کو ہدایت رد کرنے کی توفیق نہ ملتی ۔مگر جو لوگ اپنے دل کی ہدایت کو چھوڑ گئے ہمارا فیصلہ ان کے بارہ میں یہی ہے کہ ان کو ہم ان کے عمل کی سزا دیتے ہیں ورنہ ہمارا دل یہی

چاہتا کہ ان کو بھی ہدایت دیتے چنانچہ اسی مضمون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔**ولٰکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنة والناس اجمعین** یعنی ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے دوزخ میں چلا جاتا ہے۔ورنہ ہماری طرف سے تو اس کی ہدایت کے سامان موجود تھے۔

(۸)اسی طرح فرماتا ہے **وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ** (شعراء۔۹۱)ہم نے متقیوں کے لئے جنت کو قریب کر دیا ہے یعنی ایک طرف ان کی فطرت انہیں جنت کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کی مدد ان کو جنت کی طرف لے جاتی ہے اس طرح اندرونی اور بیرونی ہدائتیں ان کو جنت کی طرف راغب کرتی ہیں۔

(۹)اسی طرح فرماتا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (الذاریات۔۵۷) میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بنیں۔ یعنی تمام بنی نوع انسان کے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ عبد بنیں اور عبد کے متعلق دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ تشریح آئی ہے کہ **يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ٥**(الفجر۲۸ تا۳۱) یعنی اے نفس مطمئنہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے پر راضی ہو گیا تو اپنے رب کی طرف ایسی حالت میں لوٹ آ کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے ''تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے'' کے معنے یہ ہیں کہ وہ پاک ہے اور اس کا دل اس قدر صفائی اختیار کر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن گیا ہے **فادخلی فی عبادی** ۔اس کے بعد فرماتا ہے جب یہ مقام کسی انسان کو میسر آ جائے کہ وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہو جائے اور خدا تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کا عبد بن جاتا ہے گویا وہ جو فرمایا تھا کہ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** ۔میں نے جن وانس کو صرف اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔اس

مقصد پیدائش کو وہ پا لیتا ہے۔اور جو شخص اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لے لازماً وہ وادخلی جنتی کا مستحق ہوجاتا ہےاوراللہ تعالیٰ کی جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کی غرض یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبد بن جائیں اور جو غرض پیدائش انسانی کی اللہ تعالیٰ قرار دے اسے کون باطل کر سکتا ہے۔پھر نہ صرف اس نے پیدائش انسانی کی یہ غرض قرار دی ہے۔بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ انسانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کو وہ خوشخبری دیتا ہےاور کہتا ہے کہ یٰۤاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ہ ارْجِعِیْ اِلیٰ رَبِّكِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ہ

یہاں ایک اورلطیف اشارہ بھی کیا گیا ہےاور وہ یہ کہ نفسِ مطمئنہ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ راضیۃً مرضیۃً۔جن سے خداراضی ہوگیااور جواپنے خدا سے راضی ہوگئے۔ ادھر خدا تعالیٰ نے صحابہؓ کے متعلق فرمایا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (التوبۃ۔۱۰۰) اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگئے۔اب اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے یاایتھا النفس المطمئنۃ ہ ارجعی الیٰ ربك راضیۃ مرضیۃً ہ فادخلی فی عبادی ہ وادخلی جنتی ہ پرغور کرو۔تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یاایتھا الجماعۃ الصحابۃ ارجعی الیٰ ربك راضیۃ مرضیۃً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔گویا قرآن کریم کی ان آیتوں نے شھادت دے دی کہ صحابہ کرامؓ اس مقام تک پہنچ چکے تھے جس پر پہنچ کر انسان خدا تعالیٰ کے عباد میں داخل ہوجاتا اور اس کی جنت کا وارث ہوکراپنے مقصد حیات کو پالیتا ہے۔

(۱۰)ایک اورآیت میں جواس مضمون کوواضح کرتی ہے وہ قرآن کریم میں اسی واقعہ کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے جوحضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گزرا۔اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ

کے متعلق فرماتا ہے لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْماً (طٰہٰ ۱۱۶) یعنی حضرت آدمؑ سے جو غلطی ہوئی تھی وہ اجتہادی تھی۔اس میں ان کے عزم کا کوئی دخل نہیں تھا۔غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک اجتہادی غلطیاں اور ایک عزم کے ساتھ تعلق رکھنے والی غلطیاں۔آگے اجتہادی غلطیوں کی کئی قسمیں ہیں اور عزم والی غلطیوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ غلطی اجتہادی قسم کی تھی عزم والی غلطیوں میں سے نہیں تھی۔ارادۂ آدم نہیں تھا کہ غلطی کرے مگر ہو گئی۔اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ایک گناہ کا ظاہری حصہ ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی حصہ ہوتا ہے۔جو چیز انسان کو نجات سے محروم کرتی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گناہ کی ظاہری سزا بعض لوگوں کو مل جاتی ہے مگر نجات سے محروم کرنے والا صرف باطنی حصہ ہوتا ہے ظاہری نہیں۔مثلاً چوری ہے۔چوری کہتے ہیں کسی کا مال اٹھا کر لے جانے کو۔اب بیسیوں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلطی سے دوسرے کی چیز اٹھا کر لے جاتا ہے۔مثلاً بعض لوگوں کے پیروں میں حس کم ہوتی ہے اور وہ دوسرے کی جوتی پہن کر چلے جاتے ہیں۔فرض کرو ایسا شخص پکڑا جائے اس کا مقدمہ عدالت میں جائے اور وہ قید ہو جائے۔تو گناہ کی ایک ظاہری سزا تو اسے مل جائے گی۔مگر اس کا دل سیاہ نہیں ہوگا۔کیونکہ اس نے جوتی ارادۃً نہیں اٹھائی تھی۔

حیدرآباد کے جو نظام تھے ان کے ایک پھوپھی زاد بھائی کا بیٹا مجھے ملنے کے لئے قادیان آیا۔اس نے کسی مقصد کے لئے مجھ سے دعا کروانی تھی۔میرے دل میں خیال آیا کہ ایسے لوگ روز روز کہاں قابو میں آتے ہیں انہیں اچھی طرح نصیحت کرنی چاہیئے۔چنانچہ شام کا کھانا میں نے ان کو اپنے ساتھ ہی کھلایا اور پھر میں نے انہیں نصیحتیں کرنی شروع کر دیں اور گیارہ بارہ بجے تک انہیں سمجھاتا رہا۔میں نے کہا بتاؤ تم نماز پڑھتے ہو۔اس نے کہا کہ گھر پر تو کبھی پڑھ ہی لیتے ہیں مگر سفر میں صفائی وغیرہ کا چونکہ پورا اہتمام نہیں رہتا اس لئے نماز نہیں پڑھی

جاتی ۔میں نے کہا تم لاکھوں روپے کے مالک ہو اور اب بھی تم آئے ہو تو پانچ سات نوکر ساتھ ہیں اگر تمہارا یہ حال ہے تو غرباء کا کیا حال ہوتا ہوگا حالانکہ غرباء پر نماز زیادہ فرض نہیں۔ جیسے تم پر فرض ہے ویسے ہی ان پر فرض ہے۔ مگر تمہیں ان کے مقابلہ میں بیسیوں سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ۔تم نے گاڑی کے کمرے ریزرو کروائے ہوتے ہیں اور تم مزے سے ان میں لیٹے ہوئے آتے ہو۔تم خدا تعالیٰ کو کیا جواب دو گے اور نمازیں نہ پڑھنے کا کیا عذر پیش کرو گے ایک غریب تو کہہ دے گا کہ اللہ میاں مجھے غصہ آ گیا کہ میرے خدا نے مجھے نہیں پوچھا تو میں اس کی عبادت کیوں کروں ۔اس کا یہ جواب چاہے پاگلانہ ہو۔مگر بہر حال کچھ نہ کچھ جواب تو ہے لیکن تمہارے پاس کیا جواب ہوگا ؟میں نے دیکھا جس طرح کسی پر پورا اثر ہو جاتا ہے ویسی ہی کیفیت اس کی ہوگئی۔اس کی رونے والی حالت ہوگئی اور اس نے کہا کہ اب میں باقاعدہ نماز پڑھا کروں گا۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب ہم فارغ ہوئے اور وہ اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ۔گھر پہنچے تو انہوں نے اپنے نوکروں سے کہا صبح نماز کے لئے مجھے ضرور جگا دینا آج میں سخت شرمندہ ہوا ہوں ۔اگر کل انہوں نے پھر مجھ سے پوچھ لیا کہ نماز پڑھی تھی یا نہیں تو میں کیا جواب دوں گا ۔نوکروں نے کہا کہ آپ بارہ بجے سونے لگے ہیں نو بجے سو کر بھی آپ صبح نہیں اٹھتے اور اب تو بہت رات گذر چکی ہے آپ صبح اٹھیں گے کس طرح ؟انہوں نے کہا کچھ ہو مجھے ضرور جگا دینا۔اگر تم نے مجھے نہ جگایا تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ چنانچہ صبح ہوئی تو نوکروں نے جگا دیا۔اب وہ بیچارہ نماز پڑھنے کا عادی تو نہیں تھا۔نوکروں کے جگانے پر اٹھ تو بیٹھا مگر اسی طرح سوئے سوئے مسجد کی طرف چل پڑا کہیں ٹھوکر لگتی تو نوکر دوڑ کر اسے پکڑ لیتے ۔آخر اسی طرح مسجد پہنچے اور پھر سوئے سوئے ہی نماز پڑھی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو نیند کے غلبہ میں آتے وقت اپنا بوٹ تو وہیں چھوڑ آئے اور کسی کی پھٹی پرانی جوتی پہن کر چل پڑے نصف راہ تک پہنچے تو کسی نوکر کی نظر پڑ گئی اور اس نے کہا نواب صاحب یہ کیا؟ آپ تو کسی کی

جوتی پہن کر آ گئے ہیں۔اس پر نواب صاحب کی بھی آنکھ کھلی اور وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔بھئی جلدی جاؤ اور یہ جوتی بدل لاؤ۔ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص کہے کہ میں اس کی جوتی چرا لایا ہوں۔اس واقعہ کی وجہ سے صبح مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے میری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آج مسجد میں جا کر نماز پڑھی تھی۔مگر نیند کے غلبہ کی وجہ سے وہ اپنا نرم اور نازک اور ملائم بوٹ تو وہیں چھوڑ آئے اور کسی کی پھٹی پرانی جوتی پہن کر آ گئے۔اب دیکھو کسی نواب کے منہ پر یہ تو نہیں لکھا ہوتا کہ یہ نواب ہے۔فرض کرو جوتی کا مالک وہاں پہنچ جاتا۔اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتا کہ چل تجھے پولیس کے حوالے کروں تُو تو چور ہے۔تو بظاہر انہیں سزا مل جاتی مگر یہ غلطی انہیں نجات سے محروم کرنے والی نہیں تھی کیونکہ اس میں ان کے عزم کا دخل نہیں تھا۔اسی طرح آتشک اور سوزاک یہ دو مرضیں بظاہر گناہ کا پھل سمجھی جاتی ہیں۔لیکن ہوسکتا ہے کہ گناہ اس کا نہ ہو بلکہ اس کے باپ دادا کا ہو۔فرض کرو ایک شخص کسی بیوہ سے شادی کرتا ہے اس کے پہلے خاوند کو آتشک کا مرض تھا جس سے اسے بھی آتشک ہو گئی۔اب جب یہ اپنی بیوی کے پاس جائے گا اسے بھی آتشک ہو جائے گی اور یہ بھی اس سزا میں مبتلا ہو جائے گا۔اب بظاہر یہ ہے تو زنا کی سزا،مگر اس کی وجہ سے وہ جہنم میں نہیں جائے گا اور نہ اس کا دل سیاہ ہوگا بلکہ شاید اس کا دل اس کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ صاف ہو جائے۔تو اصل چیز جو دل کو سیاہ کرنے والی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہوتا ہے اس کے ظاہری حصہ کی وجہ سے اگر کوئی نقصان پہنچ بھی جائے تو وہ عارضی ہوتا ہے،مستقل نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ اس جگہ آدم کے متعلق فرماتا ہے کہ **لم نجد لہٗ عزماً**۔آدمؑ کے اندر ہم نے عزم نہیں پایا۔یعنی اس سے جو غلطی ہوئی وہ اجتہاداً ہوئی۔جیسے بائیبل کے حوالجات سے ثابت ہے کہ شیطان نے کہا یہ بڑا نیک کام ہے اس کے نتیجہ میں تمہیں نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہو جائے گی اور آدم نے سمجھا کہ یہ بات درست ہے اور وہ غلطی میں مبتلا ہو گئے۔پس ان کی غلطی اجتہادی غلطی تھی

عزم والی غلطی نہیں تھی۔

(۱۱)اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً (الزمر۵۴)یعنی سچی توبہ سے انسان کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کہتی ہے کہ گناہ معاف نہیں ہوتے مگر ہم یہاں یہ بحث نہیں کررہے کہ انجیل کا بیان درست ہے یا قرآن کریم کا بیان درست ہے۔ہم صرف یہ بحث کررہے ہیں کہ اس بارہ میں قرآن کریم کیا کہتا ہے۔قرآن یہ کہتا ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور جب معاف ہوجاتے ہیں تو لازماً سزا بھی معاف ہوجاتی ہے۔

(۱۲)اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتَانِ (الرحمان ۴۷) جو شخص خدا تعالیٰ کے مقام کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے اسے دو جنتیں ملتی ہیں ایک اس دنیا میں اور ایک اگلے جہان میں۔اب یہ واضح بات ہے کہ یہاں جنت ملنے سے مراد دنیوی اموال نہیں ہوسکتے۔اگر دنیوی اموال مراد لئے جائیں تو خدا تعالیٰ کے کئی نیک بندے ایسے گذرے ہیں جن کے دنیوی حالات کفار سے بہت ادنیٰ تھے۔خود رسول کریم ﷺ کو ہی لے لو۔آج یورپ کا مزدور آپ سے زیادہ اچھا کھانا کھاتا اور زیادہ اچھے کپڑے پہنتا ہے۔پس اگر اس جگہ جنت سے دنیوی نعماء مراد لی جائیں تو یقیناً یورپ کا مزدور جنت میں ہے اور بڑے بڑے صلحاء اور اولیاء نعوذ باللہ جنت میں نہیں تھے۔پس اس جگہ جنت سے مراد روحانی امن ہی ہوسکتا ہے اور جنت ملنے سے مراد خدائے تعالیٰ کے قرب کا حصول ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولمن خاف مقام ربہٖ جنتان ۔جو شخص خدا تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اس جہان میں بھی خدا تعالیٰ کا مقرب ہے اور اگلے جہان میں بھی خدا تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے گا۔اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہر انسان میں خدا تعالیٰ کا مقرب بننے کی قابلیت موجود ہے۔اگر گناہ انسان کو ورثہ میں ملا ہوتا تو اس کا قرب

اسے کہاں حاصل ہو سکتا تھا۔

(۱۳)اسی طرح فرماتا ہے **فَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (بنی اسرائیل ۷۳)جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔اب اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔کہ جو شخص اس دنیا میں جسمانی لحاظ سے اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک شخص اس جہان میں بھی اندھا ہو اور اسے اگلے جہان میں بھی اندھا رکھا جائے۔اس کے معنے بھی درحقیقت خدا تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے نہ دیکھنے والے کے ہیں گویا اندھے سے مراد وہ ہے۔جس نے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا پس **من کان فی هذه اعمیٰ فهو فی الاخرة اعمیٰ** سے دو معنی نکلتے ہیں۔ایک منفی صورت میں اور ایک مثبت صورت میں۔ایک وہ ہیں جو اعمیٰ ہیں اور ایک وہ ہیں جو اعمیٰ نہیں۔کیونکہ فرماتا ہے جو اس دنیا میں اعمیٰ ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اعمیٰ رہے گا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ لوگ اعمیٰ ہوں گے اور کچھ اعمیٰ نہیں ہوں گے پس یہ آیت بھی بتا رہی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بعض کا دل پاک بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس جگہ یہی مضمون بیان فرماتا ہے کہ اس دنیا میں جس شخص کا قلب خراب ہو گیا (معلوم ہوا کہ ساری دنیا کا قلب خراب نہیں)وہ اگلے جہان میں بھی خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھے گا۔

(۱۴)اسی طرح حدیث میں آتا ہے **کل مولودٍ یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه** (بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین)ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور نیکی کی روح اپنے اندر رکھتا ہے۔پھر اس کے ماں باپ اسے سکھا کر کبھی یہودی بنا دیتے ہیں۔کبھی نصرانی بنا دیتے ہیں اور کبھی مجوسی بنا دیتے ہیں۔اس سے بھی پتہ لگا کہ انسان جو پیدا ہوتا ہے فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور بدی پیدائش کے بعد اردگرد کے اثرات کے نتیجہ میں آتی ہے۔

(۱۵) اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ہر انسان کا دل خدا تعالیٰ نے صاف بنایا ہے پھر وہ دنیا میں آ کر یا نیکی کرتا ہے یا بدی کرتا ہے۔ جب وہ کوئی نیکی کرتا ہے تو ایک سفید نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے اور جب کوئی بدی کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ نیکیاں یا بدیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سفید یا سیاہ نقطوں کی تعداد بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے یا اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے تو وہ بدی سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اگر اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے تو وہ نیکی سے محروم ہو جاتا ہے (تفسیر ابن جریر زیر آیت **کلا بل ران علیٰ قلوبھم** سورۃ المطففین آیت ۱۵) اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ انسان فطرت صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے اور ایک لمبے عرصہ تک اس کی فطرت صحیحہ قائم رہتی ہے۔ جب اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے اور نیکی اس پر غالب آجاتی ہے تو بغیر کفارہ کے نجات پا جاتا ہے اور جب اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور بدی اس پر غالب آجاتی ہے تو پھر کوئی کفارہ اسے فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف مسیحیت یہ کہتی ہے کہ آدم نے گناہ کیا اور اس کی وجہ سے اسے سزا دی گئی۔ پھر اس کا گناہ ورثہ میں اس کی اولاد کو ملا۔ اب انسان گناہ سے خود بخود نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ یہ اسے ورثہ میں ملا ہے۔ اس کے لئے کفارہ کی ضرورت تھی جو مسیحؑ نے پیش کیا۔ اور انسان کا تمام گناہ اس نے اپنے سر اٹھا لیا۔ گویا مسیحی تعلیم کے مطابق انسان شیطان کا غلام بن کر پیدا ہوتا ہے اور پھر مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے کے نتیجہ میں شیطان کے پنجہ سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مسیحیت کے اس عقیدہ سے تعلق رکھنے والے تمام امور کا قرآن کریم نے انکار کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک نہ گناہ ورثہ میں ملا نہ انسان پیدائشی لحاظ سے گناہگار ہے اور نہ اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت ہے۔ انسان کی فطرت پاکیزہ

بنائی گئی ہے اوراس میں ترقی کی قابلیت رکھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کا محبوب بھی ہو سکتا ہے۔اوراگراس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے۔اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے تو اس عقیدہ کا رد کیا ہے۔کیا خود بائیبل بھی اس کی تصدیق کرتی ہے؟اگر بائیبل بھی اس عقیدہ کی تصدیق نہیں کرتی تو پھر عیسائیوں کے لئے بھی اس عقیدہ کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔اس بارہ میں اگر ہم غور کریں تو چار مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں:۔

ا۔ یہ مسئلہ کہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا۔

۲۔ یہ مسئلہ کہ چونکہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا اس لئے وہ پاک نہیں ہوسکتا۔

۳۔ یہ مسئلہ کہ انسان پاک نہیں ہوسکتا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ رحیم وکریم بھی ہے۔اس لئے خدا تعالیٰ کے رحم وکرم کے ماتحت اس کے لئے کسی قربانی کی ضرورت تھی۔

۴۔ یہ مسئلہ کہ اس قربانی سے انسان حقیقۃً پاک ہوگیا؟

یہ چار مسائل ہیں جو اس امر پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ آدم نے گناہ کیا تھا۔اس لئے تمام نسلِ انسانی گناہگار ہوگئی۔کیونکہ اسے ورثہ میں گناہ ملا ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا آدمؑ نے واقعہ میں گناہ کیا تھا اور آیا بائیبل اور انجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں؟اگر بائیبل کے رو سے آدمؑ نے گناہ ہی نہیں کیا تو یہ سارا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں بائیبل سے یہ ثابت ہے کہ آدمؑ نے گناہ نہیں کیا بلکہ بائیبل سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی گناہ نہیں کیا۔بلکہ اس سے بڑھ کر میں نے جب بائیبل کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ گناہ نہ آدمؑ نے کیا نہ شیطان نے بلکہ نعوذ باللہ گناہ خالص

خدا تعالیٰ کا تھا۔اس کا ثبوت میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

آدمؑ کا واقعہ پیدائش کی کتاب میں بیان ہے(یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بائیبل سے مراد وہ مجموعۂ کتب ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے حالات پر مشتمل ہے۔حضرت موسیٰؑ سے ملا کی نبی تک کے حالات کا جو حصہ ہے وہ پرانا عہد نامہ کہلاتا ہے اور حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کے حالات پر جو مشتمل ہے وہ نیا عہد نامہ کہلاتا ہے ۔یہودیوں کے نزدیک صرف پرانا عہد نامہ واجب العمل ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک پرانا اور نیا دونوں عہد نامے واجب العمل ہیں۔پرانے عہد نامہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابیں شامل ہیں۔ان میں سے پہلی کتاب پیدائش ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے)

پیدائش باب۲ آیت ۸ تا ۱۰ میں لکھا ہے:۔

''اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک وبد کی پہچان کا درخت بھی لگایا''

اس جگہ بائیبل یہ بتاتی ہے کہ آدمؑ کی پیدائش کے بعد خدا تعالیٰ نے عدن میں ایک باغ لگایا جس میں ہر قسم کے درخت اگائے اور اس باغ کے عین وسط میں حیات اور نیک وبد کی پہچان کا درخت لگایا۔یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ نیک وبد کی پہچان کا درخت الگ تھا اور حیات کا درخت الگ ۔یا دونوں ایک ہی تھے ۔میرے نزدیک یہ دونوں ایک تھے۔لیکن بائیبل اس بارہ میں مضطرب اور متردّد ہے۔کہیں وہ ان دونوں کو ایک درخت بتاتی ہے اور کہیں دو بتاتی ہے۔

آگے لکھا ہے:۔

''اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے، لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا'' (پیدائش باب۲ آیت ۱۶، ۱۷)

گویا خدا نے عدن کے باغ میں ہر قسم کے درخت لگائے اور درمیان میں حیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت لگایا اور آدمؑ سے کہا کہ تجھے اور تو تمام درختوں کے پھل کھانے کی اجازت ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا۔ اگر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ آگے حوّا کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا

''جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے'' (پیدائش باب۳ آیت ۳)

غرض پہلے تو بائبل کی اپنی روایت ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم سے یہ کہا کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا ورنہ مر جاؤ گے اور پھر حوّا کی روایت نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا تھا کہ نہ اس درخت کے پھل کو کھانا اور نہ اسے چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔

اب آدمؑ کے پاس شیطان آتا ہے (شیطان کے لئے بائبل نے سانپ کا لفظ استعمال کیا ہے) وہ آکر کیا کہتا ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ:۔

''سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے'' (پیدائش باب۳ آیت ۵)

ان روایتوں پر غور کر کے دیکھیں تو نہ آدمؑ کا گناہ نظر آتا ہے نہ شیطان کا۔ بلکہ سارا گناہ نعوذ باللہ خدا کا نظر آتا ہے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت زندگی کا درخت اور

نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا۔یعنی اس درخت سے زندگی حاصل ہوتی تھی اور اس درخت سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہوتی تھی مگر بائیبل کہتی ہے کہ خدا نے آدمؑ سے یہ کہا کہ:۔

''جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا'' (پیدائش باب۲ آیت ۱۷)

گویا خدا نے آدم سے جھوٹ بولا۔ درخت تو وہ زندگی کا تھا۔ درخت تو وہ علم کی ترقی کا تھا۔مگر خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ جس روز تو نے اس میں سے کچھ کھایا تو مر جائے گا۔مرنے کے معنے جسمانی بھی ہو سکتے ہیں اور روحانی بھی۔لیکن کوئی معنی لے لئے جائیں۔ دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔اگر روحانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ نیک و بد کی پہچان سے انسان کی روحانی موت نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے روحانی زندگی ملتی ہے اور اگر جسمانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کا درخت تھا۔جس کے کھانے سے موت نہیں آسکتی تھی۔غرض بائیبل کے خدا نے آدم کو دھوکہ دیا کہ وہ درخت جو زندگی بخشنے والا تھا، وہ درخت جو عقل پیدا کرنے والا تھا۔اس کے متعلق یہ کہا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ۔ ورنہ مر جاؤ گے اور حوا بھی یہی کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے کہا کہ

''تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے'' (پیدائش باب۳ آیت ۳)

صاف پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ من ذالک غلط بیانی کی اور آدم کو دھوکہ دیا۔اس کے مقابلے میں جب شیطان نے کہا کہ

''تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے'' (پیدائش باب۳ آیت ۵)

تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ دونوں باتیں وہی تھیں جو اس درخت کے خواص میں شامل تھیں۔ وہ حیات کا درخت تھا اور وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی اس کے کھانے

سے زندگی بھی ملتی تھی اوراس کے کھانے سے نیک و بد کی کے پہچاننے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی تھی ۔پس شیطان نے آدم کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ بائیبل کی رو سے خود خدا نے نعوذ باللہ آدم کو دھوکہ دیا ۔پھر اور آگے دیکھو ۔جب آدم اور حوا نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو کیا وہ مر گئے؟ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ رہے اور شیطان کی بات ہی سچی نکلی کہ ’’تم ہرگز نہ مرو گے‘‘ خدا تعالیٰ کی یہ بات کہ ’’جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا‘‘ غلط نکلی ۔اسی طرح وہ اس درخت کو کھا کر جیسا کہ بائیبل میں آگے ذکر آتا ہے نیک و بد کو بھی پہچاننے لگ گئے ۔پس بائیبل کے رو سے آدم اور شیطان کا کوئی قصور نہیں خود خدا نے ان کو دھوکہ دیا۔آدم نے کوشش کی کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے لگے اور آدمی بن جائے اور اس کو دنیا کا کوئی شخص بدی نہیں کہہ سکتا۔آدم نے نیکی کے راستہ میں ترقی کرنے کی کوشش کی اور شیطان نے کہا کہ خدا تمہیں دھوکہ دے رہا ہے ۔وہ کہتا ہے کہ اس کے کھانے سے تم مر جاؤ گے حالانکہ تم مرو گے نہیں بلکہ زندہ رہو گے اور پھر اس کے کھانے سے تمہارے اندر عقل پیدا ہو جائے گی اور تمہیں سمجھ آجائے گی کہ نیکی کیا چیز ہے اور بدی کیا چیز ہے اور بائیبل خود مانتی ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے ان کے اندر عقل پیدا ہوگئی اور وہ نیک و بد کو پہچاننے لگ گئے ۔پس نہ آدم نے گناہ کیا اور نہ شیطان نے ۔گناہ کا مرتکب صرف ایک ہی ہے اور وہ بائیبل کا خدا ہے ۔جس نے حیات کے درخت کو جھوٹ بول کر موت کا درخت ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے کھانے سے تم مر جاؤ گے ۔اور یہ مرنا یا جسمانی ہوسکتا تھا یا روحانی ۔مگر دونوں باتیں غلط تھیں جسمانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ حیات کا درخت تھا اور روحانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی انسان کو ایک نئی روحانی زندگی بخشنے والا تھا۔پس اگر گناہ کیا تو آدم نے نہیں کیا بلکہ **نعوذ باللہ** خدا نے کیا اور آدم کو دھوکہ دیا۔

یہاں عیسائیت یہ نہیں کہہ سکتی کہ خدا باپ نے جھوٹ بولا ہے ۔خدا بیٹے نے جھوٹ نہیں

بولا۔کیونکہ عیسائیت میں جب خدا تعالیٰ کا ذکر ہوتو اس سے مراد اقنوم ثلاثہ ہوتے ہیں۔باپ خدا بیٹے سے جدا نہیں اور بیٹا روح القدس سے جدا نہیں۔پس جب باپ خدا نے جھوٹ بولا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیٹے نے بھی جھوٹ بولا اور روح القدس نے بھی جھوٹ بولا۔

پس اگر گناہ ورثہ میں آیا تو بائیبل کی رو سے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آدم گناہگار نہ تھا بلکہ خدا یا دوسرے لفظوں میں یسوع گناہگار تھا۔جس نے نعوذ باللہ من ذالک جھوٹ بولا اور اسی پر سارا الزام آتا ہے۔بہرحال بائیبل نے خدا تعالیٰ کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا ہے جو نہایت خطرناک اور افسوسناک ہے اور ان حوالجات کی موجودگی میں یسوع ہرگز نجات دہندہ نہیں کہلاسکتا۔یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ جھوٹ بولنے والا اور دوسرے کو دھوکا اور فریب دینے والا نجات دہندہ ہوسکے۔بائیبل بتاتی ہے کہ خدا نے جھوٹ بول کر آدم سے کہا کہ تم اس درخت کا پھل کھانے سے مرجاؤ گے اور تمہیں نقصان پہنچے گا۔حالانکہ وہ زندگی کا درخت تھا وہ نیک وبد کی پہچان کا درخت تھا اس کے کھانے سے نہ جسمانی لحاظ سے آدم مرسکتا تھا اور نہ روحانی لحاظ سے مرسکتا تھا۔

پھر آدم کے گناہگار نہ ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ اسے جو غلطی لگی وہ محض اجتہادی تھی۔قرآن کریم نے بھی یہی بتایا ہے کہ آدم سے اجتہادی غلطی ہوگئی اور اگر ہم بائیبل کے واقعہ کو صحیح مانیں تب بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آدم سے اجتہادی غلطی ہوئی۔پیدائش باب ۱ آیت ۲۷۔۲۸ میں لکھا ہے:۔

''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔نر و ناری ان کو پیدا کیا''

یعنی انسان جس کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس میں مرد بھی شامل ہے اور عورت بھی۔انسان مرد بھی خدا کی صورت پر بنایا گیا اور انسان عورت بھی خدا کی صورت پر

بنائی گئی ہے۔اب خدا کی صورت پر بنانے کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی اسی طرح ناک، کان، آنکھ اور منہ وغیرہ ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات آدمؑ میں آگئیں اور جب خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور بتایا کہ تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم میری صفات کے مظہر بنو۔تو یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ نیک و بد کے پہچاننے کی صفت آدم میں نہ آتی۔پس شیطان نے آدم سے کہا کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے اور اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے کی طاقت رکھتا ہے۔پس جس طرح خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے تمہیں بھی نیک و بد کو پہچاننا چاہیئے۔اور اس کا طریق یہی ہے کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھالو۔اگر تم اسے کھاؤ گے نہیں تو نیک و بد کی پہچان کس طرح کرو گے۔اور جب نیک اور بد کو پہچاننے کی قابلیت تم میں پیدا نہ ہوگی تو تم خدا تعالیٰ کی صفات کے کامل مظہر نہیں بن سکو گے۔پس ضروری ہے کہ تم اس درخت کا پھل کھاؤ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اس درخت کا پھل کھا کر خدا تعالیٰ کی طرح ہو جاؤ یا تیسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ اگر تم اس درخت کا پھل کھالو گے تو تم اس مقصد کو حاصل کرلو گے جس کے لئے خدا نے تم کو پیدا کیا ہے۔

فرض کرو تمام واقعہ اسی طرح ہوا ہو تو اس کے بعد آدم کو اگر اجتہادی غلطی لگ گئی تو اس میں اس کا قصور کیا تھا۔ایک شخص آدم کے پاس آتا ہے۔اور آکر کہتا ہے کہ تم کو معلوم ہے کہ تمہیں خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا ہے اور تم کو معلوم ہے کہ اس کے معنے صرف اتنے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہو اور تم کو پتہ ہے کہ اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچانتا ہے۔پس اگر تم نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھالو گے تو تم اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کرلو گے اور خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر بن جاؤ گے۔یہ اتنی زبردست دلیل تھی کہ آدم اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بالکل درست ہے

بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آدم کے ایک دفعہ دھوکہ کھانے کے باوجود اگر آج بھی اسی رنگ میں لوگوں کے سامنے دلیل پیش کی جائے تو کئی لوگ آج بھی دھوکہ کھا جائیں گے اور سمجھیں گے کہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہی تھا کہ اس درخت کا پھل کھالیا جائے۔ یہ منشاء نہیں تھا کہ اسے نہ کھایا جائے۔

غرض آدم کو غلطی لگنے کا امکان بائبل کے رو سے موجود ہے۔ خود بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ نیک و بد کو پہچاننا خدا تعالیٰ اپنی صفت قرار دیتا ہے پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ میں لکھا ہے:۔

''اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔''

اس جگہ ''ہم'' سے عیسائیوں کے نزدیک اقنوم ثلاثہ مراد ہیں یعنی ہم اقنوم ثلاثہ میں سے ایک کی مانند اور یہودیوں کے نزدیک ''ہم'' سے خدا اور اس کے فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے اسی طرح فرشتے بھی نیک و بد کو پہچانتے ہیں۔ پس یہودیوں کے نزدیک تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے خدا اور اس کے فرشتے نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں اسی طرح آدمؑ بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا۔ اور عیسائیوں کے نزدیک اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے باپ خدا اور بیٹا خدا اور روح القدس خدا نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں۔ اسی طرح آدم بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا۔

اس حوالہ سے صاف پتہ لگ گیا کہ نیک اور بد کو پہچاننا خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور جو اسے پہچانتا ہے وہ خدا جیسا ہو جاتا ہے یا خدا کی صورت پر ہو جاتا ہے یا بائبل کی رو سے اُس صورت پر ہو جاتا ہے جس صورت پر اسے خدا نے پیدا کیا۔

ضمناً میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ حیات کے درخت کے بارہ میں بائبل کا خیال عجیب مضحکہ خیز ہے۔ پیدائش باب ۲ آیت ۱۰ و ۱۷۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخت ایک ہی تھا۔ لکھا ہے خدا نے ''باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی

لگایا'' یہاں مفرد لفظ ''لگایا'' استعمال کیا گیا ہے ''لگائے'' جو جمع کا لفظ ہے وہ یہاں استعمال نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی درخت میں یہ دونوں صفات تھیں ۔اس کے کھانے سے حیات بھی ملتی تھی اوراس کے کھانے سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت بھی پیدا ہوتی تھی ۔

اس کے بعد آیت ۱۷ میں لکھا ہے:۔

''خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔''

یہاں سے بھی پتہ لگتا ہے کہ ایک درخت ہے اور ایک درخت سے ہی آدم کو روکا گیا۔اگر دو درخت ہوتے تو دونوں سے روکنا چاہئیے تھا مگر وہ منع کرتا ہے ایک درخت سے ۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی حیات کا درخت تھا۔اور وہی نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا۔لیکن پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ و ۲۳ میں لکھا ہے:۔

''اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔''

یہاں دو درخت ہو گئے ۔نیک و بد کی پہچان کا درخت الگ ہو گیا۔حیات کا درخت الگ ہو گیا۔چونکہ آدم نے نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کھا کر نیک و بد کو پہچاننے کی قابلیت پیدا کر لی تھی اس لئے خدا نے اسے باغِ عدن سے باہر نکال دیا کہ کبھی وہ حیات کے درخت کا پھل بھی نہ کھا لے اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث نہ ہو جائے۔

پھر پیدائش باب ۲ آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ سے پہلے آدم کے لئے موت

مقرر نہ تھی۔ کیونکہ لکھا ہے:۔

''جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا''

جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر آدم اور حوا اس میں سے نہیں کھائیں گے تو وہ نہیں مریں گے۔ پس موت اس درخت میں سے کھانے کا نتیجہ تھی اگر نہ کھاتے تو وہ کبھی نہ مرتے۔ اسی طرح پیدائش باب ۳ آیت ۴ میں آتا ہے کہ ''تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مرجاؤ گے''

اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ موت کو اس درخت کا پھل کھانے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح رومیوں باب ۵ آیت ۱۲ میں لکھا ہے کہ۔ ''گناہ کے سبب سے موت آئی''

پھر یعقوب باب ا آیت ۱۵ میں لکھا ہے:۔ ''گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے''

ان حوالجات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بائبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ اگر تم نے اس درخت میں سے کچھ کھایا تو مرجاؤ گے۔ حالانکہ تھا وہ درخت حیات کا۔ اور حیات کے درخت میں سے کھا کر انسان مرتا نہیں جیتا ہے۔

دوسری طرف رومیوں اور یعقوب میں لکھا ہے کہ موت گناہ کے نتیجہ میں آئی یعنی اگر وہ گناہ نہ کرتے تو نہ مرتے۔ اب ہم اس کے ساتھ پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ کو ملاتے ہیں تو حیرت آتی ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو باغِ عدن میں سے نکال دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ حیات کے درخت میں سے کچھ کھا کر ہمیشہ زندہ رہے۔ حالانکہ جب گناہ کا نتیجہ موت تھا تو چونکہ وہ پہلے نیک وبد کے درخت میں سے کھا کے گناہگار بن چکا تھا اس لئے خواہ دس ہزار دفعہ بھی وہ اس درخت میں سے کھاتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ پس یا تو یہ کہنا چاہئیے کہ گناہ کا نتیجہ موت نہیں اس درخت کے کھانے کا نتیجہ زندگی ہے لیکن ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے اور دوسری طرف بائبل یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو باغ عدن میں سے نکال دیا تا ایسا نہ ہو کہ وہ درخت میں سے کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے معلوم

ہوا کہ گناہ کا نتیجہ موت نہیں بلکہ اس درخت کا پھل کھانے کے نتیجہ میں گناہ کے باوجود انسان زندہ رہ سکتا ہے۔

پھر یہ سوال ہے کہ آدم کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے گناہ کیا۔ حالانکہ آدم کے باپ نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا نہ آدم کی ماں نے کوئی گناہ کیا تھا۔ اگر بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی گناہ کیا ہو بیٹا گناہ کرسکتا ہے تو بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی نیکی کی ہو بیٹا نیکی بھی کرسکتا ہے اور اگر آدم نیکی کرسکتا تھا تو باقی لوگ کیوں نہیں کر سکتے؟ معلوم ہوا کہ اس میں ورثہ کا کوئی سوال نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ ترقی بھی کرسکتا ہے اور تنزل بھی کرسکتا ہے۔ آدمؑ کا باپ گناہگار نہیں تھا بلکہ اس کا تو کوئی باپ تھا ہی نہیں۔ مگر آدم نے گناہ کرلیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ گناہ اور نیکی دونوں خاص حالات میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور ان چیزوں میں ورثہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

پس کفارہ ایک بلاضرورت شے ہے۔

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم کا گناہ کس طرح بخشا گیا؟ اگر توبہ سے بخشا گیا تو اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے اور کفارہ کی کوئی ضرورت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

غرض وہ ساری بنیاد جس پر کفارہ کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسائیت کہتی ہے کہ چونکہ انسان گناہ سے خود بخود نجات نہیں پا سکتا اس لئے کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے بائبل اور خود انجیل کی گواہی سے باطل ثابت ہوتی ہے۔

پھر بائبل سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ کا سارا واقعہ تمثیلی ہے اور اس پر کسی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب حوا نے درخت کا پھل کھالیا اور پھر آدم کو بھی دیا۔

''تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں''

(پیدائش باب ۳ آیت ۷)

درخت کا پھل کھانے سے ننگا ہوجانا۔ یہ صاف بتاتا ہے کہ اس واقعہ میں تمثیلی زبان اختیار کی گئی ہے۔ پھر لکھا ہے۔

''اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز کو جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی'' (پیدائش باب ۳ آیت ۷،۸)

یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے تمثیلی ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ ٹھنڈک اور گرمی پیدا کرنے والا خود خدا ہے۔ اور اسے ان چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ یہ نہیں کہ جس طرح لوگ گرمی کے موسم میں کوئٹہ اور مری چلے جاتے ہیں اس طرح خدا تعالیٰ کو بھی ضرورت ہے کہ وہ ٹھنڈے وقت باہر نکلا کرے اور گرمی سے اپنے آپ کو بچائے۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ٹھنڈا وقت دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ ابھی سورج نہیں نکلا باغ میں پھرنا شروع کر دیا تا کہ گرمی سے اسے تکلیف نہ ہو۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے استعارہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح لکھا ہے:۔

''اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا''۔ (آیت ۸)

یہ بھی تمثیلی زبان ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ قرآن کریم میں بھی ذکر آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ سے مخفی ہو۔ خواہ زمین کی سطح پر کوئی چیز ہو یا تحت الثریٰ میں۔ سب اس کے علم میں ہیں مگر بائبل بتاتی ہے کہ آدم اور حوا باغ کے درختوں میں چھپ گئے۔ تا کہ خدا تعالیٰ انہیں دیکھ نہ سکے۔ یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے تمثیلی ہونے کا ثبوت ہیں۔

پھر ایک اور بات لکھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کے علم کی محدودیت کا پتہ چلتا ہے لکھا ہے:۔

''تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا تو کہاں ہے'' (آیت ۹)

گویا وہ خدا جو زمین وآسمان کے ذرہ ذرہ کو جانتا ہے جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں کہ ارے آدم تو کہاں ہے۔ ارے آدم تو کہاں ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے ورنہ وہ تو عرش پر بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا تو مخلوق کی نگرانی کس طرح کر رہا ہے؟ غرض بائبل بتاتی ہے کہ جب وہ باغ میں چھپ گئے تو خدا تعالیٰ نے انہیں آوازیں دینی شروع کر دیں کہ اے آدم تو کہاں ہے۔

''اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱۰)

کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے آدم کا یہ خیال کر لینا کہ میں باغ میں چھپ کر خدا تعالیٰ کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاوں گا یہ بھی عقل کے بالکل خلاف ہے۔

غرض یہ حوالہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اس جگہ ظاہری واقعہ مراد نہیں بلکہ تمثیلی رنگ میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور استعارہ کی زبان اس کے اظہار کے لئے اختیار کی گئی ہے اور تمثیلی کلام اور استعارات ہمیشہ تعبیر طلب ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بھی ایک تعبیر طلب کلام ہے نہ کہ حقیقی واقعہ۔

پس جس کلام پر اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے کہ آدم نے گناہ کیا اور اس کا دل سیاہ ہو گیا ہم کہتے ہیں کہ وہ سارا کلام ہی تمثیلی ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ کا باغ میں پھرنا۔ اس کا ٹھنڈے وقت سیر کے لئے آنا۔ آدم کا اسے نظر نہ آنا اور پھر اللہ تعالیٰ کا آدم کو آوازیں دینا اور کہنا اے آدم تو کہاں ہے۔ یہ سب تمثیلی کلام ہے۔ اسی طرح باقی واقعہ بھی تمثیلی ہے۔ پس اس پر کسی مذہبی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے خلاف ہے۔

پھر جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں آدم کا گناہ کر لینا حالانکہ اس کا نہ باپ تھا نہ ماں،

بتا تا ہے کہ گناہ اور نیکی دونوں خاص حالات میں ظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور مٹ بھی سکتے ہیں۔پس کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔اگر باہر سے نیکی نہیں آسکتی تو پھر باہر سے گناہ بھی نہیں آسکتا۔اور اگر گناہ باہر سے آسکتا ہے تو نیکی بھی آسکتی ہے۔اگر آدم جس کا نہ باپ تھا نہ ماں ۔اس کے اندر باہر سے گناہ آ گیا تو اولاد میں باہر سے نیکی بھی آسکتی ہے ۔یہ دونوں چیزیں مساوی سمجھی جائیں گی۔

پھر بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ آدم گناہ کے باوجود خدا تعالیٰ کا مقدس رہا۔ایسا کیوں ہوا؟اس کا جواب عیسائیوں کی طرف سے یہی دیا جاتا ہے کہ آدمؑ کا گناہ بخشا گیا۔ہم کہتے ہیں اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جاسکتا ہے ان کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

کفارہ کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے یا انسان کے نفس کے ایسے خراب ہو جانے کے لئے کہ اس کی درستی اور اصلاح ناممکن ہو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد انسان خراب ہو گیا اور وہ نیکی پر قائم نہیں رہ سکا تو پھر بائبل کے مطابق کفارہ کو درست تسلیم کرنا پڑے گا لیکن اگر بائبل سے ہی پتہ لگے کہ آدم کے گناہ کے بعد (جسے قرآن کریم گناہ قرار نہیں دیتا) انسان خراب نہیں ہوا بلکہ وہ نیکی پر قائم رہا تو پھر کفارے کی بنیاد ہی باطل ہو جاتی ہے جب کفارہ کے بغیر انسان نیک بھی ہوسکتا تھا اور گناہ سے بھی بچ سکتا تھا تو اس کی نجات کے لئے کسی نئی چیز کی ضرورت نہ رہی۔اس بارہ میں ہم انجیل ہی کی تعلیم لے لیتے ہیں۔رومیوں باب ۵ آیت ۱۴ میں لکھا ہے:۔

’’آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے ان پر بھی بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا۔‘‘

اس جگہ آنے والے سے مراد مسیحؑ ہے اور آنے والے کا مثیل آدم کو قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے ان پر بادشاہت کی جنہوں نے آدم کی

طرح (جو مسیح کا مثیل تھا) گناہ نہیں کیا تھا۔ گویا پولوس مانتا ہے کہ آدم سے لے کر موسیٰ تک بہت سے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا تھا۔ اور جب انہوں نے گناہ نہیں کیا تھا تو یہ ثابت ہوا کہ انسان گناہ سے بچ سکتا ہے بہر حال انجیل مانتی ہے کہ آدم کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ حضرت مسیح کی صلیب کے واقعہ کے بعد جب لوگوں کی طرف سے اعتراضات ہوئے تو گھبراہٹ میں جلدی سے بنا لیا گیا تھا۔ اسی لئے حواری کبھی کچھ کہہ دیتے تھے اور کبھی کچھ۔ مثلاً یہی فقرہ جس کو اوپر درج کیا گیا ہے صاف طور پر بتا تا ہے کہ آدمؑ سے لے کر موسیٰ تک ایسے کئی لوگ گذرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا گویا آدم کے گناہ کرنے کے باوجود اس کی اولاد کو ورثہ میں گناہ نہیں ملا۔ لیکن اسی کتاب کے اسی باب کی بارھویں آیت میں لکھا ہے کہ۔

''یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اس لئے کہ سب نے گناہ کیا''

یعنی آدم کو گناہ کی سزا موت ملی۔ اور آدم کی وجہ سے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا۔

''کیونکہ شریعت کے دئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔'' (رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا پولوس ایک ہی باب میں دو آیتیں لکھتا ہے پہلے تو یہ لکھتا ہے کہ چونکہ سب نے گناہ کیا اس لئے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی (کیونکہ موت کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ گناہ کے نتیجہ میں آئی ہے) لیکن آیت ۱۴ میں جا کر کہہ دیا کہ

''موت نے ان پر بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا''

لیکن اب انہیں ایک اور مشکل پیش آ گئی اور وہ یہ کہ مسیحیوں کے نزدیک حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے شریعت شروع ہوئی ہے پہلے نہیں ۔جب پہلے کوئی شریعت ہی نہیں تھی تو گناہ کہاں تھا؟اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ

''شریعت کے دئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔'' (رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا ان کے نزدیک شریعت اور گناہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔اس میں ہم بھی ان سے متفق ہیں۔شریعت الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ اس اس طرح نہ کرو ورنہ خدا تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا اور گناہ تب ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس سے شریعت نے بنی نوع انسان کو بصراحت روکا ہو ورنہ شریعت کے نزول سے پہلے گناہ محسوب نہیں ہوتا پس اتنی بات تو درست ہے۔لیکن خواہ شریعت موجود نہ ہو جو چیز بری ہے وہ بہر حال بری ہوگی۔مثلاً قرآن کریم نازل ہوا اور اس نے کہا کہ ظلم نہ کرو۔یہ بہت بڑا گناہ ہے اور ہم نے سمجھ لیا کہ ظلم کرنا اچھا نہیں۔لیکن اگر قرآن کریم میں یہ حکم نازل نہ ہوتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ ظلم نہ کرو۔تو پھر بھی ظلم کرنے والا ایک برے فعل کا مرتکب ہوتا۔یہی حال اور برائیوں کا ہے۔شریعت نازل نہ ہوتی تو پھر بھی برائیاں، برائیاں ہی رہتیں۔فرق صرف اتنا ہوتا کہ ایک فعل کو دس بیس آدمی برا کہتے اور دس بیس آدمی برا نہ کہتے۔پچاس ساٹھ کہتے کہ یہ نیکی ہے اور پچاس ساٹھ کہتے یہ نیکی نہیں۔ بہر حال احساس برائی کا اور احساس نیکی کا یہ شریعت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا فطرت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔یہی چیز پولوس پیش کرتا ہے کہ دنیا میں گناہ تھا لیکن جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا تھا اور یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ گناہ ہے۔ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی موقعہ پر شریعت نہ ہو تو ہر برا فعل گناہ تو ہوگا لیکن وہ گناہ شریعت کے مطابق محسوب نہیں ہوگا مثلاً ایک جگہ پر شریعت موجود نہیں اور لوگ نمازیں نہیں پڑھتے۔فرض کرو وہ

جنگلوں میں رہتے ہیں یا دور پہاڑوں پر رہتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہو چکے ہیں تو خدا تعالیٰ ان سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے (دین حق) کی بتائی ہوئی نمازیں کیوں نہیں پڑھیں یا تم نے (دین حق) کا بتایا ہوا روزہ کیوں نہیں رکھا۔ کیونکہ اس نماز اور روزہ کا تو انہیں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ حدیثوں میں صاف طور پر آتا ہے کہ قیامت کے دن چار قسم کے لوگ شرعی مواخذہ سے محفوظ ہوں گے۔ اول مادر زاد بہرے، دوم پاگل، سوم پیر فرتوت۔ چہارم وہ لوگ جن تک (دین حق) کی (دعوت) نہیں پہنچی اور وہ اسی حالت میں فوت ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے امتحان کے لئے ان کی طرف کوئی اور رسول مبعوث کیا جائے گا اگر وہ اسے مان لیں گے تو نجات پا جائیں گے اور اگر نہیں مانیں گے تو سزا پائیں گے (روح المعانی جلد ۴ زیر آیت **وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولاً**) اس کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے قرآن کریم سے استدلال کر کے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کا محاسبہ فطرت کے مطابق ہوگا یعنی قرآن کریم کی شریعت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا محاسبہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر جو باتیں رکھی ہیں ان کے ماتحت ان کا محاسبہ ہوگا۔ انسانی فطرت بھی بعض چیزوں کو گناہ قرار دیتی ہے۔ بغیر اس کے کہ شریعت انسان کی راہنمائی کرے۔ حضرت خلیفہ اول ۔۔۔ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک چور آپ کے پاس علاج کے لئے آیا۔ آپ نے اسے نصیحت کی کہ تم لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہو یہ بہت بری بات ہے تمہیں اس قسم کی حرام کمائی سے بچنا چاہئیے ۔ اس نصیحت کو سن کر وہ کہنے لگا واہ مولوی صاحب آپ نے بھی مولویوں والی ہی بات کی ۔ بھلا ہمارے جیسا بھی کوئی حلال مال کماتا ہے۔ آپ تو تھوڑی دیر نبض پر ہاتھ رکھ کر فیس وصول کر لیتے ہیں اور ہم سردی کے موسم میں ٹھٹھرتے ہوئے اور اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے جاتے ہیں ۔ کس طرح ہمیں پولیس کا ڈر رہتا ہے کس طرح قدم قدم پر ہمیں پکڑے جانے کا

خوف ہوتا ہے مگر ہم تمام مصیبتوں کو برداشت کرنے کے بعد جاتے ہیں اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر روپیہ لاتے ہیں۔ بھلا ہم سے زیادہ حلال کی کمائی اور کس کی ہو سکتی ہے؟ آپ فرماتے تھے یہ سن کر میں نے جھٹ اسے اور باتوں میں لگا دیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس سے پوچھا کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا ہم سات آٹھ آدمی مل کر چوری کرتے ہیں ایک گھر کی ٹوہ لگانے والا ہوتا ہے جو بتاتا ہے کہ فلاں گھر میں اتنا مال ہے۔ایک سیندھ لگانے کا مشّاق ہوتا ہے۔ایک باہر کھڑا پہرہ دیتا رہتا ہے دو آدمی گلی کے سروں پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ادھر آئے تو فوراً بتا دیں۔ایک آدمی اندر جانے والا ہوتا ہے اور ایک آدمی اچھا لباس پہن کر دور کھڑا ہوتا ہے جس کے پاس چوری کا تمام مال جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو شبہ نہ کرے بلکہ سمجھے کہ یہ کوئی شریف آدمی ہے جو اپنا مال لئے کھڑا ہے باقیوں نے اپنے جسم پر تیل ملا ہوا ہوتا ہے اور وہ لنگوٹ باندھ کر اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔پھر ایک سنار ہوتا ہے جس کو ہم تمام زیورات دے دیتے ہیں اور وہ سونا گلا کر ہمیں دے دیتا ہے اور ہم سب آپس میں مل کر تقسیم کر لیتے ہیں جب وہ یہاں تک پہنچا تو حضرت خلیفہ اول ۔۔۔۔ فرماتے تھے میں نے کہا اگر وہ سنار سارا مال لے جائے اور تمہیں کچھ نہ دے تو پھر تم کیا کرو گے؟ اس پر وہ بے اختیار کہنے لگا۔کیا وہ اتنا بے ایمان ہو جائے گا کہ دوسروں کا مال کھا جائے؟ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نگاہ میں بھی ایمان اور بے ایمانی میں کچھ فرق ضرور ہے اور تمہاری فطرت سمجھتی ہے کہ فلاں فعل بے ایمانی ہے اور فلاں فعل نیکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی یہی فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی فطرت پر امتحان ہو جائے گا اللہ تعالیٰ یہ نہیں کہے گا کہ تم نے وہ نماز کیوں نہیں پڑھی جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتائی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ یہ کہے گا کہ تمہاری فطرت میں کسی نہ کسی ہستی کی عبادت کا مادہ رکھا گیا

تھا تم یہ بتاؤ کہ اس فطرت کی آواز کے مطابق تم نے عبادت کی تھی یا نہیں؟ یا مثلاً جھوٹ ہے، چوری ہے، ڈاکہ ہے۔ دوسرے کا مال تو انسان کھا لیتا ہے لیکن جب اس کا اپنا مال کوئی شخص اٹھا لیتا ہے تو کہتا ہے فلاں بڑا بے ایمان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی چیز کھانا یہ بھی بے ایمانی سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شریعت کے مطابق اس کو مجرم نہیں کہا جائے گا لیکن فطرت کے مطابق وہ مجرم ہوگا اور اسے سزا دی جائے گی۔ پس یہ مسئلہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ درست ہے تو پھر کفارہ کہاں رہا؟

انجیل اگر یہ کہتی کہ فطرتِ انسانی لعنت ہے تو پھر یہ مسئلہ قائم رہ جاتا۔ لیکن انجیل یہ کہتی ہے کہ شریعت لعنت ہے (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) یعنی وہ جو انسان کا نفس کسی فعل کو گناہ قرار دیتا ہے انجیل اس کے خلاف نہیں بلکہ انجیل یہ کہتی ہے کہ شریعت لعنت ہے۔ یعنی شریعت میں ایسے احکام دئے گئے ہیں جن پر لوگ عمل نہیں کر سکتے اور وہ کہتی ہے کہ اسی وجہ سے مسیحؑ نے شریعت اڑا دی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موسیٰؑ سے پہلے بھی شریعت اڑی ہوئی تھی اور انسان کی نجات کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ فطرت کے مطابق عمل کر کے وہ نجات پا جاتا تھا یا فطرت کے خلاف عمل کر کے سزا پا لیتا تھا۔ پھر اب کسی کفارہ کی کیا ضرورت ہے؟ گویا اصل مسئلہ صرف اتنا بنا کہ موسیٰ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے شریعت بھیج کر لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیا۔ مگر اس کا علاج کفارہ نہیں تھا۔ اصل علاج صرف اتنا تھا کہ شریعت کو منسوخ کر دیا جاتا۔ یہ چاہے کتنی ہی بیوقوفی کی بات ہوتی مگر بہر حال جہاں تک علاج کا سوال ہے اصل علاج صرف اتنا تھا۔ کیونکہ رومیوں کے حوالہ سے صاف ماننا پڑتا ہے کہ موسیٰ سے پہلے شریعت نہیں تھی اور بوجہ شریعت نہ ہونے کے لوگوں کو شریعت کے ماتحت گناہگار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا اور جب شریعت کے مطابق وہ گناہگار نہیں تھے تو شریعت انہیں سزا بھی نہیں دلا سکتی تھی اور پھر رومیوں کے حوالہ کے

مطابق ایسے لوگ بھی تھے جو گناہگار نہیں تھے یعنی فطرت کے گناہگار بھی نہیں تھے۔

ان سارے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو خرابی پیدا ہوئی وہ آدم کے گناہ کی وجہ سے۔۔۔۔ پیدا نہیں ہوئی بلکہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی اس غلطی سے ہوئی کہ اس نے موسیٰؑ کے ذریعہ ایک شریعت نازل کر دی۔ جب لوگ اس پر عمل نہ کر سکے اور ان کی سزا کا سوال آیا تو اللہ تعالیٰ نے یسوع مسیح کو بھیج کر شریعت کو ہمیشہ کے لئے اڑا دیا۔ حالانکہ اس کے لئے یسوع مسیح کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس خدا نے موسیٰ کو شریعت دی تھی وہی یوشعؑ کو کہہ دیتا کہ چونکہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اس لئے میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر گناہ ہوتا ہے مگر محسوب نہیں ہوتا تو پھر خدا تعالیٰ کا عدل کہاں رہا۔ کفارہ کی دوسری بنیاد عدل پر رکھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ بنی نوع انسان کو گناہوں کی سزا نہ دے تو وہ عادل نہیں رہتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ صرف نام بدل دینے سے تو کوئی چیز اپنی ماہیت سے الگ نہیں ہوسکتی۔ ایک چور چوری کر رہا ہے اور ہم کہتے ہیں۔ اس کو کوئی سزا نہیں ملے گی کیونکہ ابھی موسیٰ کی شریعت نازل نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور شخص چوری کرتا ہے اور ہم کہتے ہیں یہ دائمی جہنم میں جائے گا کیونکہ موسیٰؑ کی شریعت اس کو گناہگار قرار دیتی ہے۔ حالانکہ چیز ایک ہے اس نے بھی اسی طرح مال اٹھایا ہے جس طرح پہلے نے اٹھایا ہے مگر ایک کے فعل کو ہم اس لئے جرم قرار نہیں دیتے کہ موسیٰؑ کی شریعت ابھی نازل نہیں ہوئی۔ اور ایک کو ہم اس لئے جرم قرار دے دیتے ہیں کہ موسیٰؑ کی شریعت نازل ہو چکی ہے۔ ایک کو ہم چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے کو ہم پکڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں سے ایک ہی فعل سرزد ہوا ہے۔ یہ کہاں کا عدل ہے اور کونسا انصاف اس کی اجازت دیتا ہے۔ بہر حال عدل تو پھر بھی نہ رہا۔ یا مثلاً جھوٹ بولنا یا لوگوں پر ظلم کرنا ہے۔ اگر اس سے ہم لوگوں کو منع نہیں کرتے یا یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص نے جھوٹ بول کر یا

ظلم کر کے گناہ کیا۔تو ان فعلوں کا مرتکب متقی اور پاک دل کس طرح ہوسکتا ہے؟محض ہمارے نہ روکنے کی وجہ سے۔محض ہمارے جھوٹے کو گناہگار نہ کہنے کی وجہ سے یا ظالم کو گناہگار نہ کہنے کی وجہ سے یا چور کو گناہگار نہ کہنے کی وجہ سے وہ متقی کس طرح بن سکتا ہے؟اور اگر وہ گناہگار نہیں اور ایک دوسرا شخص انہی افعال کی وجہ سے گناہگار کہلاتا ہے تو عدل تو پھر بھی قائم نہ رہا۔

یہاں تک تو اصولی اور فلسفیانہ طور پر میں نے بحث کی ہے۔اب میں یہ بتاتا ہوں کہ عملاً بھی بائبل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نیک لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔حنوکؔ جو حضرت آدم کے پڑپوتے اور نوحؑ کے پردادا تھے ان کے متعلق لکھا ہے:۔

''حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس کے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اور وہ غائب ہوگیا کیونکہ خدا نے اسے اٹھالیا'' (پیدائش باب ۵ آیت ۲۲ تا ۲۴)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حنوک خدا تعالیٰ کے ساتھ چلتے رہے۔اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ حنوک اور خدا دونوں سفر پر اکٹھے رہے اور جس طرح لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ چلو امریکہ دیکھ آئیں یا کسی اور ملک کی سیر کر آئیں اسی طرح وہ تین سو سال تک خدا تعالیٰ کے ساتھ سیریں کرتے رہے۔یہ بائبل کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حنوک نیک انسان تھا اور خدائی صفات اس نے اپنے اندر پیدا کر لی تھیں یعنی جو کام خدا تعالیٰ کرتا ہے وہی کام حنوک کیا کرتا تھا۔وہ بڑا رحم کرنے والا تھا،وہ بڑا احسن سلوک کرنے والا تھا،وہ ظلم نہیں کرتا تھا،وہ ہر شخص سے پیار اور محبت سے پیش آتا تھا،وہ عدل اور انصاف سے کام لیتا تھا،وہ غرباء کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔اسی طرح خدا تعالیٰ کی یہ صفات کہ وہ رب ہے،رحمان ہے،رحیم ہے۔مالک ہے،غفور ہے۔یہ ساری صفات اس میں پائی جاتی تھیں

اور پھر وہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ گویا مسیح کے ساتھ اسے کلی مشابہت تھی اور ویسا ہی مقام حنوک کو حاصل تھا۔ جیسے مسیح کو حاصل ہوا۔ بلکہ مسیح کو تو ساری زندگی تیس سال ملی مگر حنوک ۳۶۵ سال زندہ رہا اور تمام عمر اس نے نیکی اور تقویٰ میں بسر کی۔ اس سے پتہ لگا کہ حنوک جو آدمؑ کا پڑپوتا اور نوح کا پڑدادا تھا وہ اتنا نیک تھا کہ گویا خدا کی مثال تھا اور پھر وہ زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اس کے ساتھ جب ہم حضرت مسیح کا یہ حوالہ ملاتے ہیں کہ

''آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا اس کے جو آسمان سے اترا'' (یوحنا باب ۳ آیت ۱۳)

تو حنوک کا مقام اور بھی واضح ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حنوک کا آنا بھی آسمان سے ہی تھا تبھی وہ آسمان پر چلا گیا۔

درحقیقت اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ آسمان پر جانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ اپنا تصرف رکھتا ہے اور انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے حنوک بھی تھے، جنہوں نے بچپن سے ہی خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کے رحم کے سایہ کے نیچے پرورش پائی اور بقول بائبل وہ بھی آسمان پر اٹھا لئے گئے۔

پھر حنوک سے بھی زیادہ شاندار ذکر بائبل میں ملک صدق سالم کا موجود ہے اور انجیل بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب عراق میں ظلم ہوئے اور ان کے چچا اور بھائیوں نے انہیں دکھ دیا تو خدا تعالیٰ نے ان سے کہا کہ یہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے جائیں صرف حضرت لوطؑ آپ پر ایمان لائے تھے وہ لوطؑ کو ساتھ لے کر چلے۔ آپ کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ راستہ میں مصر سے ہوتے ہوئے اور حضرت ہاجرہؑ سے شادی کرتے ہوئے فلسطین پہنچے۔ اس ملک کے متعلق آپ کو بشارت مل چکی تھی کہ یہاں آپ کو جگہ دی جائے گی اور آپ کو ماننے والے یہاں

پیدا ہو جائیں گے ۔ جب آپ فلسطین میں آ کر بس گئے اور ارد گرد کے بادشاہوں نے دیکھا کہ ابراہیم لوگوں میں مقبول ہو رہا ہے تو انہوں نے آپ سے لڑائی کی ۔آپ بھی ان کے مقابلہ میں نکلے اور انہیں شکست دی ۔ جب آپ انہیں شکست دے کر واپس آ رہے تھے تو ملک صدق سالم ایک بادشاہ آپ سے ملا ۔ وہ اپنے زمانہ میں بہت بڑا نیک اور بزرگ اور ولی اللہ سمجھا جاتا تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غنیمت کے اموال کا دسواں حصہ ملک صدق سالم کی خدمت میں پیش کیا۔ ملک صدق سالم نے اس روپیہ کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ روپیہ کی مجھے ضرورت نہیں جو آدمی آپ پکڑ لائے ہیں صرف وہ دے دیے جائیں ،لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں یہ مال آپ کو ضرور دوں گا تا ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ ملک صدق سالم کی وجہ سے میں دولت مند ہوا ہوں گو یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبول کیا

(پیدائش باب۱۴ آیت ۱۸ تا ۲۴)

انجیل میں اس واقعہ کو زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لکھا ہے :۔

’’یسوع ہمیشہ کے لئے ملک صدق کے طریقہ کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو کے طور پر داخل ہوا ہے‘‘ (عبرانیوں باب ٦ آیت ۲۰)

اس جگہ پولوس اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یسوع مسیح ہمیشہ کے لئے ملک صدق سالم کے طریقہ کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو کے طور پر داخل ہوا ہے یعنی باقی لوگ تو مر جاتے ہیں ۔موسیٰؑ آئے اور فوت ہو گئے داؤدؑ آئے اور فوت ہو گئے ،سلیمان آئے اور فوت ہو گئے لیکن ملک صدق سالم نہیں مرا۔اسی طرح مسیح بھی نہیں مرا۔ پھر آگے لکھا ہے :۔’’اور یہ ملک صدق سالم کا بادشاہ ۔خدا تعالیٰ کا کاہن ہمیشہ کاہن رہتا ہے‘‘

(عبرانیوں باب ۷ آیت ۱)

یعنی ملک صدق سالم پر کبھی موت نہیں آتی ۔ پھر لکھا ہے:۔

''جب ابراہام بادشاہوں کو قتل کر کے واپس آتا تھا تو اسی نے اس کا استقبال کیا۔اور اس کے لئے برکت چاہی''

(عبرانیوں باب ۷ آیت ۱)

یعنی ملک صدق سالم نے ابراہیمؑ کو برکت دی ۔معلوم ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بڑا سمجھتا تھا۔ کیونکہ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ملک صدق سالم نے یہ نہیں کہا کہ اے ابراہیم خدا تجھے برکت دے بلکہ اس نے یہ کہا کہ اے ابراہیم تیرے مال میں برکت ہو یعنی میں تجھے برکت دیتا ہوں۔

اور لکھا ہے:۔

''اسی کو ابراہیم نے سب چیزوں کی دہ یکی دی''

آگے لکھا ہے:۔

''یہ اول تو اپنے نام کے معنیٰ کے موافق راستبازی کا بادشاہ ہے (کیونکہ صدق راستبازی کو کہتے ہیں)اور پھر سالم یعنی صلح کا بادشاہ (سالم سلامتی سے نکلا ہے) یہ بے باپ، بے ماں، بےنسب نامہ ہے۔نہ اس کی عمر کا شروع نہ زندگی کا آخر بلکہ خدا کے بیٹے کے مشابہ ٹھہرا'' (عبرانیوں باب ۷ آیت ۳)یعنی ملک صدق سالم کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی۔وہ خدا تعالیٰ کی طرح ازلی ابدی تھا۔نہ اس کی عمر کا کوئی شروع ہے اور نہ زندگی کا آخر۔نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی مرتا ہے۔وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ ہے اور خدا تعالیٰ کے بیٹے کے مشابہ ہے۔ جس طرح مسیحؑ ازل سے ابد تک ہے (وہ مسیحؑ نہیں جو مریم کے پیٹ سے پیدا ہو۔ بلکہ وہ مسیح جو اقنوم ثلاثہ میں شامل ہے)اسی طرح ملک صدق سالم بھی ازلی ابدی ہے۔نہ اس کی کوئی ابتداء ہے نہ انتہاء۔

اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک اور وجود بھی تھا جو نیک تھا اور ایسا نیک تھا کہ وہ راستبازی اور صلح کا بادشاہ تھا اور ابراہیم کو برکت دینے کا حق رکھتا تھا۔

پھر انجیل میں حضرت زکریاؑ اور ان کی بیوی کے متعلق لکھا ہے:۔

''وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام وقوانین پر بے عیب چلنے والے تھے'' (لوقا باب ا آیت ۶)

پھر یوحنا کے بارہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کو فرشتے نے کہا:۔

''وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا'' (لوقا باب ا آیت ۱۵)

گویا یوحنا پر روح القدس کا نزول ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد نہیں ہوگا بلکہ ابھی وہ ماں کے پیٹ میں ہی ہوگا کہ روح القدس اس پر نازل ہوگا اور وہ اسے اپنے تصرف میں لے لیگا اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب کسی پر ماں کے پیٹ میں ہی روح القدس نازل ہو جائے گا تو وہ گناہ کا مرتکب ہی نہیں ہو سکے گا۔

غرض یوحنا کے متعلق بھی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ اور خرابی ان کے قریب نہیں آئی۔ بلکہ حضرت مسیحؑ نے یہاں تک کہا کہ:۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں'' (متی باب ۱۱ آیت ۱۱)

اس طرح اس نے یوحنا کو اپنی ذات سے بھی بالا ثابت کیا۔ کیونکہ مسیحؑ بھی عورت سے پیدا ہوا تھا اور یوحنا بھی عورت سے پیدا ہوئے۔

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ انجیل کے رو سے حضرت زکریاؑ اور ان کی بیوی دونوں بے عیب تھے اور خدا تعالیٰ کے قانون پر چلنے والے تھے۔ اسی طرح یوحنا ماں کے پیٹ سے ہی

روح القدس سے بھرے ہوئے تھے اور وہ کامل اور بے عیب تھے۔اب اگر یوحنا اور زکریا اور ان کی بیوی بے گناہ ہو سکتے ہیں تو اسی قانون کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کیوں بے گناہ نہیں ہو سکتے، جب عملاً حضرت مسیح سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں جو کفارہ واقعہ ہونے سے پہلے نیک، راستباز، بے عیب اور شریعت پر چلنے والے تھے تو معلوم ہوا کہ کفارہ کے بغیر بھی دنیا میں نیکی قائم تھی۔اور جب کفارہ کے بغیر دنیا میں نیکی قائم تھی تو آئندہ بھی قائم رہ سکتی ہے اور اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بعض دفعہ مسیحی علماء اس سوال کے متعلق کہ پہلے لوگ جو نجات پا گئے تھے۔انہوں نے کس طرح نجات پائی اور پہلے لوگوں میں سے جو نیک گذرے ہیں وہ کس طرح نیک ہوئے تھے؟ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ پہلے لوگ بھی مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے سے نیک ہوئے تھے اور مسیح کے کفارہؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہی ان کو نجات ملی تھی۔مگر ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ محض ڈھکوسلہ ہے۔وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد محض اس بات پر رکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤد اور بعض انبیاء نے مسیحؑ کی خبر دی تھی حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیوں میں کہیں مسیح کی خبر کا پتہ نہیں لگتا۔یہ محض ایک دھوکہ ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنی خبر دی تھی کہ ان کی اولاد کو بابرکت کیا جائے گا اور یہ کہ ان کی اولاد کے ذریعہ خدا تعالیٰ اپنے تقدس کو ظاہر کرے گا۔ظاہر ہے کہ خبر اولاد ابراہیم کے حق میں ہے کسی خاص فرد کے حق میں نہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آجاتے ہیں۔حضرت اسحاق علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آجاتے ہیں۔اسی طرح یعقوبؑ۔یوسفؑ۔موسیٰؑ۔داؤدؑ اور زکریاؑ سب اس پیشگوئی کے ماتحت آتے ہیں۔بعض اور نبیوں کی پیشگوئیوں سے بے شک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آنے والے مسیح کی خبر دے رہے ہیں لیکن کسی آنے والے کے متعلق

خبر دینا اور یہ خبر دینا کہ خدا تعالیٰ کا ایک بیٹا ہوگا جو لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگا اور اس کے بغیر دنیا کو نجات نہیں مل سکے گی ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے قریباً ہر نبی کی خبر پہلے نبیوں نے دی ہے حضرت یحیٰؑ کی خبر پہلے سے موجود تھی حضرت داؤد کی خبر پہلے سے موجود تھی اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبر بھی پہلے سے موجود تھی مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ ان کے آنے کی اس رنگ میں خبر موجود تھی کہ ان کے کفارہ پر ایمان لانے سے دنیا کو نجات ملے گی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خبر اپنی اولاد کے متعلق دی تھی وہ خبر اگر فرض کرو اس مفہوم کی بھی ہو کہ آئندہ زمانہ میں میرا ایک بیٹا ایسا ہوگا جس سے دنیا کو نجات ملے گی تو بہرحال وہ مسیح پر چسپاں نہیں ہوسکتی کیونکہ مسیحؑ کے دعویٰ کی ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔عیسائیت کہتی ہے کہ آدم کے بیٹے کا گناہگار ہونا ضروری ہے اور گناہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔پس ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا وجود تلاش کیا جائے جو آدم کا بیٹا نہ ہو۔چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنا اکلوتا بیٹا یسوع مسیح دنیا میں بھیجا تا کہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے اگر مسیح خدا تعالیٰ کا بیٹا تھا تو پھر وہ ابراہیم کا بیٹا نہیں تھا اور اگر ابراہیم کا بیٹا تھا تو کفارہ کا موجب نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا بیٹا نہیں تھا۔پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کو مسیحؑ پر چسپاں کرنا کفارہ کی ساری بنیاد ہی اکھیڑ دیتا ہے۔مجھے یاد ہے میں چھوٹا تھا سترہ اٹھارہ سال میری عمر ہوگی کہ میں لاہور گیا۔اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں کسی پادری سے گفتگو کروں۔لاہور کا سب سے بڑا پادری جو بعد میں مشنری کالج سہارنپور کا پرنسپل مقرر ہوگیا تھا میں اسے ملنے چلا گیا اور میں نے اسے یہی سوال کیا کہ پہلے لوگ کس طرح نجات پاتے تھے؟ وہ کہنے لگا وہ بھی مسیحؑ پر ایمان رکھتے تھے اور اس ایمان کی وجہ سے ہی انہوں نے نجات پائی۔میں نے کہا اگر میں کہہ دوں کہ مجھ پر ایمان لاکر انہوں نے نجات پائی ہے تو پھر اس کا کیا حل ہوگا؟ وہ کہنے لگا پیشگوئی بھی تو ہونی

چاہیئے ۔میں نے کہا یہ ٹھیک ہے آپ یہ بتائیں کہ مسیحؑ کے متعلق کونسی پیشگوئی تھی؟اس نے ابراہیمؑ کی پیشگوئی پیش کی ۔میں نے کہا آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری پیشگوئیاں نکال لیں ان میں ایک طرف یہ آتا ہے کہ میں اسحاق کی اولاد کو یوں برکت دوں گا تو ساتھ ہی اسمٰعیلؑ کی اولاد کا بھی ذکر ہے۔اگر آپ کا یہ حق ہے کہ آپ اس پیشگوئی کو مسیحؑ پر چسپاں کریں تو ہمیں کیوں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اس پیشگوئی کو محمد رسول اللہ ﷺ پر چسپاں کرلیں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے تھے؟ پھر میں نے کہا آپ میرے اس سوال کا جواب دیں کہ کفارہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا۔اگر وہ ابراہیم کا بیٹا تھا تو کفارہ نہیں ہوسکتا۔میرے اس سوال پر اس نے بڑے چکر کھائے حالانکہ وہ پچپن ساٹھ سال کی عمر کا تھا۔ آخر گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا مجھے معاف فرمائیں ۔یونانی میں ایک مثل ہے کہ ہر بیوقوف سوال کرسکتا ہے مگر جواب دینے کے لئے عقلمند انسان چاہیئے ۔گویا اس نے مجھے بیوقوف بنایا اور اپنے متعلق کہا کہ میں اتنا عقلمند نہیں کہ ہر بیوقوف کا جواب دے سکوں۔ میرا ابھی اسوقت جوانی کا زمانہ تھا میں بھلا کب رکنے والا تھا۔میں نے کہا مجھے بڑا افسوس ہے میں آپ کو عقلمند سمجھ کر ہی آیا تھا۔تو مسیحؑ اگر ابراہیم کی اولاد میں سے تھا تو کفارہ باطل ہوجاتا ہے اور اگر وہ خدا کا بیٹا تھا تو ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی ۔گویا دونوں صورتوں میں اعتراض پیدا ہوتا ہے ۔ایک صورت میں مسیح کفارہ نہیں بن سکتا اور دوسری صورت میں ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں سے کسی آنے والے کی خبر دی ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ ہے کون ۔حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میری اولاد میں سے ایک شخص آئے گا اور ابراہیمی نسل میں بھی یہ مشہور رہے کہ اس نے کسی بڑے آدمی کے ظہور کی خبر دی تھی۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو آدمی کھڑے ہوتے ہیں۔ایک کہتا ہے میں

اس پیشگوئی کا مستحق ہوں دوسرا کہتا ہے میں اس پیشگوئی کا مستحق ہوں۔ایک سے ہم پوچھتے ہیں کہ تیرے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو اس پیشگوئی کا مصداق ہے؟ وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اور اس کا باپ ابراہیم تھا۔دوسرے سے ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم ابراہیم کی نسل میں سے ہو وہ کہتا ہے میری ماں فلاں تھی۔وہ فلاں سے بیاہی گئی اور وہ شخص جس سے میری ماں بیاہی گئی وہ فلاں کا بیٹا تھا وہ فلاں کا بیٹا تھا اور وہ ابراہیم کا بیٹا تھا۔کیا دنیا کا کوئی بھی معقول آدمی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ وہ واقعہ میں ابراہیم کی اولاد میں سے ہے۔وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا، دادا فلاں تھا، پردادا فلاں تھا اور اس طرح چلتے چلتے وہ اپنا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میری ماں فلاں سے بیاہی گئی تھی اور وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا۔ہر شخص اسی کی بات مانے گا جو اپنے باپ دادا کا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا رہا ہو۔اس کی بات کوئی نہیں مانے گا جو اپنی ماں کے شوہر کو ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دے کر یہ سمجھ رہا ہو کہ میں بھی ابراہیم کی اولاد میں سے ہوں۔مسیحؑ اور آنحضرت ﷺ کی یہی کیفیت ہے۔حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ متی باب ۱ میں درج کیا گیا ہے اور جسے ''یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ'' قرار دیا گیا ہے اس کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ

''یعقوب سے یوسف پیدا ہوا یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے''(انجیل متی باب ۱ آیت ۱۶)

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک مسیح کا نسب نامہ نہیں پہنچتا بلکہ یوسف کا نسب نامہ پہنچتا ہے جن سے حضرت مریم بیاہی گئی تھیں۔اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ میرا باپ عبداللہ تھا وہ عبدالمطلب کا بیٹا تھا اور اسی طرح چلتے چلتے آپ اس نسب نامہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتے ہیں۔پس ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں کہ تم جس

وجود پر ابراہیم کی پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہواور جسے ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دیتے ہو وہ تو صاف کہتا ہے کہ میری ماں مریم جس سے بیاہی گئی تھی وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا میں ابراہیم کی اولاد میں سے نہیں۔لیکن ہم جس وجود پر اس پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہیں یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ وہ یقینی طور پر حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر تم اس پیشگوئی کا مصداق حضرت مسیحؑ کو کس طرح قرار دیتے ہو۔

باقی رہا یہ دعویٰ کہ میں دنیا کا نجات دہندہ ہوں، یہ محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی کہا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰه** (آل عمران ۳۲) اے محمد رسول اللہ ﷺ تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو اور میری بیعت میں شامل ہو جاؤ۔نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف تم نجات پا جاؤ گے بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے انسان کو صرف نجات ہی نہیں ملتی بلکہ وہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ** (انفال ۲۵) کہ اے مومنو! خدا اور اس کے رسول کے احکام کو قبول کرو کیونکہ وہ تمہیں زندہ کرنے کے لئے اپنی طرف بلا رہا ہے۔اس جگہ محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو زندہ کرتے ہیں اور چونکہ انجیل خود تسلیم کرتی ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے۔اس لئے ان الفاظ میں درحقیقت محمد رسول اللہ ﷺ کو دنیا کا نجات دہندہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی اتباع میں ہی بنی نوع انسان کو اس موت سے نجات مل سکتی ہے جو گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

کفارہ کے متعلق ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تین اقنوم تھے تو پھر مسیحؑ کے

ذمہ کفارہ کیوں لگایا گیا۔ مان لیا کہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا۔ یہ بھی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ آدم کا گناہ ورثہ کے طور پر اس کی اولاد میں چلا گو یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔اس کے بعد ہم یہ تیسری احمقانہ بات بھی مان لیتے ہیں کہ ورثہ کا گناہ ایسی چیز ہے جو کسی طرح علاج پذیر نہیں ہوسکتا۔اس کے لئے بہرحال کوئی خارجی علاج چاہئیے ۔پھر یہ چوتھی احمقانہ بات بھی ہم مان لیتے ہیں کہ اس ورثہ کے گناہ کا علاج کفارہ ہے۔گو یہ علاج بالکل ویسا ہی ہے جیسے ہمارے ملک کی مثل ہے کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کسی کے گھٹنے پر چوٹ لگی تو اس نے اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ ہائے مر گیا۔ہائے مر گیا۔ یہ بھی بالکل وہی بات ہے کہ دنیا سے گناہ دور نہیں ہوسکتا لیکن مسیحؑ کے صلیب پر لٹکنے سے وہ گناہ دور ہو گیا۔ یہ بالکل بے جوڑ بات ہے۔لیکن چلو ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی خدائی طاقتوں والا وجود چاہئیے ۔مگر سوال یہ ہے کہ اس غرض کے لئے خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا۔آخر رحم کی صفت خدا باپ میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ جب وہ دنیا پر اتنا رحم کرتا ہے کہ جس کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔تو خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو کفارہ کے لئے پیش کر دیا؟ روح القدس خدا نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ بیٹے نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا؟اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یا تو یہ بات ماننی پڑے گی کہ خدا باپ اور روح القدس کے مرنے سے دنیا فنا ہو جاتی ہے اس لئے خدا بیٹے نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔لیکن اس صورت میں ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیٹا ناقص خدا ہے اس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہوسکتی تھی اس لئے اسے پیش کر دیا گیا۔ باپ خدا نے اپنے آپ کو اس لئے پیش نہ کیا کہ اگر وہ مر گیا تو ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے دل میں بنی نوع انسان کی اتنی محبت اور اتنا پیار نہیں تھا جتنا پیار خدا کے بیٹے کے دل میں تھا مگر یہ جواب خدا باپ اور خدا

روح القدس دونوں کو ناقص قرار دیتا ہے۔دوسرے انجیل کے بھی خلاف ہے۔کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ خدا محبت ہے(نمبر۲ کرنتھیوں باب۱۳ آیت ۱۱)اور یہ فقرہ نہ روح القدس کے متعلق ہے نہ مسیح کے متعلق ہے۔غرض ایک صورت میں بیٹا ناقص قرار پاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک غیر ضروری شئے تھا جس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہوسکتی تھی۔لیکن اگر خدا باپ مرجاتا تو ساری دنیا تباہ ہوجاتی۔اوراگر بیٹے کے دل میں بنی نوع انسان کی کامل محبت تھی تو پھر باپ خدا اور روح القدس خدا دونوں ناقص قرار پاتے ہیں۔بہرحال دونوں صورتوں میں ایک نہ ایک خدا ضرور ناقص قرار پاتا ہے اور ناقص چیز تمام مذاہب کے مسلمہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہوسکتی۔

پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہودیت کے نزدیک کفارہ ضروری ہے؟ ہم کہتے ہیں بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ کفارہ ضروری نہیں۔اس لئے کفارہ کی ضرورت تب پیش آئی ہے جب گناہ معاف نہ ہوسکتے ہوں۔لیکن بائبل کہتی ہے کہ گناہ معاف ہوسکتے ہیں اور تمام بائبل گناہوں کی معافی کی تعلیم سے بھری ہوئی ہے۔اسی طرح ان قربانیوں کی تعلیم سے بھری پڑی ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور مقبول ہوتی ہیں۔ بلکہ بائبل بتاتی ہے کہ خود آدمؑ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی قربانیوں کو خدا نے قبول کیا اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دی۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

’’چندروز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اس کے ہدیہ کو منظور کیا (یعنی ہابل بھی خدا تعالیٰ کا مقرب ہوگیا اور اس کا ہدیہ بھی منظور ہوگیا) پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔(یہ قائن وہی ہے جسے ہمارے ہاں قابیل کہتے ہیں) اس لئے قائن نہایت غضبناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا۔اور خداوند نے قائن سے کہا

تو کیوں غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے۔(یعنی خدا تعالیٰ نے جب قائن کے ہدیہ کو قبول نہ کیا تو اس کا منہ بگڑ گیا اور اسے سخت غصہ آیا۔اللہ تعالیٰ نے اس کا منہ بگڑا ہوا دیکھا تو اس نے کہا کہ اے قائن تجھے کیوں غصہ آیا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے)اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پر تو اس پر غالب آ''(پیدائش باب۴ آیت ۳ تا ۷)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ:۔

اوّل باوجود آدم کے گناہ کے اس کے بعض بیٹوں کی قربانی قبول ہوتی تھی۔چنانچہ ہابیل کی قربانی قبول ہوئی اور وہ خدا تعالیٰ کا منظور نظر ہو گیا۔کیونکہ لکھا ہے کہ ''خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا'' ہابل کو قبول کرنے کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا نے ہابل کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے اس کو اپنا منظورِ نظر بنا لیا اور اس کے ہدیہ کو ایک زندہ قربانی تصور کیا جو انسان کے درجہ کو برابر بڑھاتی چلی جاتی ہے۔کیونکہ ہدیہ قبول کرنے کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس کا نتیجہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو ملنا شروع ہو جائے۔اب ہابل اور قائن دونوں آدم کی اولاد تھے اور آدم کے گناہ کے بعد پیدا ہوئے۔ان دونوں میں ورثہ کے طور پر گناہ آنا چاہیئے تھا۔مگر باوجود اس کے کہ وہ گناہ لے کر پیدا ہوئے تھے جب انہوں نے قربانی کی تو ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قربانی رد کی گئی۔اگر ورثہ میں انہیں گناہ ملا تھا تو اوّل تو انہیں قربانی کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی اور اگر کرتے تو دونوں کی قربانیاں رد کر دی جاتیں۔

دوم۔اسی حوالہ میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قائن سے کہا:

''اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا''

یعنی اگر تو نیک بنے تو کیا خدا تجھے اپنا مقرب نہ بنائے گا۔ان الفاظ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے

کہ اگر تو نیک بننا چاہے تو بن سکتا ہے اور نیک بننے کا دروازہ تیرے لئے ہر وقت کھلا ہے اور ''کیا تو مقبول نہ ہوگا'' کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا مقبول اور اس کا مقرب بننے کا دروازہ بھی تیرے لئے کھلا ہے جو نجات سے بڑا درجہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک بنی نوع انسان خدا تعالیٰ کے حضور عمل سے مقبول ہوتے تھے نہ کہ کفارہ سے۔اور یہ کہ گناہ کرنے کے بعد بھی انسان توبہ سے مقبول ہوسکتا تھا۔اور یہ دونوں باتیں بتاتی ہیں کہ ہر انسان نیک بھی بن سکتا ہے اور ہر انسان خدا تعالیٰ کا مقرب بھی ہوسکتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو قائن جو گناہ کی وجہ سے نامقبول ہو چکا تھا اسے یہ نہ کہا جاتا کہ ''اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا''

سوم۔پھر لکھا ہے:۔''اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے''

مسیحیت کہتی ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد گناہ انسان کے دل میں بویا گیا۔ورثہ کے بھی یہی معنی ہوتے ہیں۔مگر بائبل کہتی ہے کہ گناہ اس کے دل میں نہیں گیا بلکہ وہ اس کے گھر کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسان کے دل میں نہیں بلکہ باہر سے آتا ہے۔پس بائبل کے نزدیک آدم کے گناہ کے بعد گناہ کا بیج انسان کے دل میں نہیں بویا گیا بلکہ ہر انسان کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے۔گویا گناہ ایک خارجی شے ہے نہ کہ ورثہ کی چیز جو جزو بدن ہو جاتی ہے۔

چہارم۔پھر لکھا ہے:۔

''پر تو اس پر غالب آ''

یعنی اے قائن تو اس پر غالب آ۔جب خدا کہتا ہے تو ایسا کر۔تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ایک چھوٹے بچے کو پیار میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے (سوائے اس کے کہ ہم غلط مذاق کر رہے ہوں) کہ جا اور موٹر کو اٹھا لا یا جا اور ہاتھی کو پکڑ لا۔ہم اس سے وہی بات کہیں گے جو اس کی

طاقت کے اندر ہوگی ۔اگر دفتر میں ہی کوئی افسر اپنے چپڑاسی کو بلائے اور کہے کہ جیکب آباد کی طرف جو انجن جاتا ہے وہ اٹھا کر لے آ۔تو تم جانتے ہو وہ کیا کرے گا؟ وہ چپ کر کے اور کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک جائے گا۔اس کے چہرے کا رنگ اڑ جائے گا اور وہ دوسروں سے جا کر کہے گا کہ صاحب پاگل ہوگیا ہے ۔کیونکہ اس نے ایک ایسی بات کہی ہے جو انسانی طاقت میں ہی نہیں ۔اسی طرح اگر گناہ دب ہی نہیں سکتا تھا تو خدا تعالیٰ نے قائن سے یہ کیوں کہا کہ تو اس پر غالب آسکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کی قربانی کو رد کر دیا اور کہا کہ چونکہ تو نے اس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی نہیں کی جس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی قبول ہو سکتی ہے ۔اس لئے میں تیری قربانی کو قبول نہیں کرتا۔مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ میں نے جو قربانی کی رد کر دی ہے وہ ہمیشہ کے لئے رد کر دی ہے تیرے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ تو گناہوں پر غالب آجائے اور میرا قرب حاصل کر لے ۔گویا انسان کے لئے اپنی ذاتی جدوجہد سے گناہ پر غالب آنا ممکن تھا۔

غرض آدم کا گناہ تو الگ رہا۔قائن کے اپنے گناہ کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دبائی نہ جا سکے۔اگر تو کوشش کرے تو گناہ پر غالب آسکتا ہے اور میں تجھے یہی نصیحت کرتا ہوں کہ تو اس پر غالب آ۔

اوپر کے حوالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی قابیلؔ کے متبع ہیں اور مسلمان ہابیل کے متبع ۔کیونکہ عیسائی کفارہ کے معانی کے قائل ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے اس لئے دشمن ہیں کہ قابیل کی طرح ان کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔پس وہ اس کا بدلہ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کی جماعت سے لینا چاہتے ہیں ۔پھر جیسا کہ خدا تعالیٰ نے قابیل سے کہا تھا کہ ''اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے'' آج کل ہمیں وہی

نظارہ نظر آرہا ہے۔عیسائی دنیا میں اس کثرت کے ساتھ گناہ پایا جاتا ہے کہ اس کی کوئی حد ہی نہیں۔

بہرحال بائبل کے نزدیک انسان بعد از گناہِ آدم بھی نیک ہوسکتا تھا اور یہ کہ گناہ کا بیج اس کے دل میں نہیں بویا گیا تھا۔ بلکہ اس وقت بھی وہ باہر سے آتا تھا اور اگر وہ گناہ کر بیٹھتا تھا تب بھی اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا تھا اور آئندہ گناہ پر غالب آنے کا امکان اس کے لئے موجود تھا۔ بلکہ نہ صرف وہ گناہ پر غالب آنے کی طاقت رکھتا تھا بلکہ وہ خدا تعالیٰ کا مقبول ہونے کی بھی طاقت رکھتا تھا۔ پس وہ کیفیت جس کے نتیجہ میں کفارہ کی ضرورت مسیحی بتاتے ہیں بائبل کے بیان کی رو سے موجود ہی نہیں۔

ایک سوال کفارہ کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرض کرو دنیا میں نیکی موجود نہیں تھی اور فرض کرو کہ کفارہ کی ضرورت تھی۔ پھر بھی کیا اس کفارہ کے لئے خدا تعالیٰ کے بیٹے کی ضرورت تھی۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا؟

یہ سوال کہ کفارہ کی ضرورت تھی ۔اس کے لئے ہم خود مسیحؑ کی کتاب کو دیکھتے ہیں۔ بائبل اس بات کو مانتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء مختلف معجزات دکھاتے رہے ہیں۔اس کے نزدیک نبی مردے زندہ کرتے تھے۔ نبی بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ نبی تھوڑے سے کھانے کو بڑھا دیتے تھے۔اسی طرح اور قسم قسم کے معجزات دکھاتے تھے۔لیکن مسیحی کہتے ہیں (میں مسیحیوں کا لفظ اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ بہت سی باتیں اپنے پاس سے کہہ دیتے ہیں اور باوجود اس کے کہ انجیل بگڑ چکی ہے۔ پھر بھی ان باتوں کا انجیل سے ثبوت نہیں ملتا) کہ گناہ کا معاف کرنا یہ انسانی طاقت سے بالا ہے۔انبیاء بے شک مردے زندہ کر لیتے تھے۔جیسا کہ ایلیاہ نبی اور الیسع کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے مردے زندہ کئے (نمبر۱ سلاطین باب ۱۷ آیت ۲۲) مگر گناہ کا معاف کر دینا یہ ناممکن تھا اور اس کے لئے بیٹے کے کفارہ کی ضرورت تھی۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا انجیل اس عقیدہ کی تصدیق کرتی ہے۔

انجیل میں لکھا ہے کہ لوگ ایک مفلوج کو چار پائی پر پڑا ہوا مسیح کے پاس لائے۔مسیح نے اسے دیکھا اور کہا:۔

''بیٹا خاطر جمع رکھ تیرے گناہ معاف ہوئے'' (متی باب ۹ آیت ۲)

اس پر لوگ حیران ہو گئے کہ کیا یہ گناہ معاف کرتا ہے۔یہی بات آجکل مسیحیت کہتی ہے کہ انسان گناہ کس طرح معاف کر سکتا ہے۔لیکن انجیل میں لکھا ہے کہ:۔

''یسوع نے ان کے خیال معلوم کر کے کہا کہ تم کیوں اپنے دلوں میں برے خیال لاتے ہو۔آسان کیا ہے یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہ کہنا کہ اٹھ اور چل پھر''

یعنی ان دونوں میں سے کونسی آسان بات ہے۔ایک مفلوج کو یہ کہہ دینا کہ اٹھ اور چل پھر یہ آسان ہے یا ایک گناہگار کو یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یہ آسان ہے۔مسیحیت کی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اٹھ اور چل پھر کہنا زیادہ آسان ہے اور یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے ناممکن ہے۔لیکن حضرت مسیح کے متعلق انجیل بتاتی ہے کہ انہوں نے کہا:۔

''اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے (اس نے مفلوج سے کہا) اٹھ اپنی چار پائی اٹھا اور اپنے گھر چلا جا۔وہ اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا لوگ یہ دیکھ کر ڈر گئے اور خدا کی تمجید کرنے لگے جس نے آدمیوں کو ایسا اختیار بخشا''

(متی باب ۹ آیت ۲ تا ۸)

گویا پہلے حضرت مسیحؑ کے گناہ معاف کرنے کے فقرہ پر لوگ حیران ہوئے کہ کیا آدم زاد بھی لوگوں کے گناہ معاف کر سکتا ہے مسیح نے کہا کہ اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے میں اس مفلوج سے یہ کہتا ہوں کہ اٹھ۔اپنی چار پائی اٹھا اور اپنے گھر چلا جا۔اس پر وہ اور حیران ہوئے اور اس خدا کی تمجید کرنے لگے جس نے آدمیوں کو

ایسا اختیار بخشا ہے۔ یہ واقعہ جو انجیل میں آتا ہے بتاتا ہے کہ گناہ معاف کرنا اور کسی بیمار سے یہ کہنا کہ اٹھ اور اپنے گھر چلا جا یہ معجزہ آدمیوں کا ہے خدا کا نہیں۔

اسی طرح یوحنا باب ۸ آیت ۱ تا ۱۱ میں ایک زانیہ عورت کا قصہ درج ہے جس میں بتایا گیا ہے۔ کہ اس عورت کو مسیح نے معاف کر دیا۔ حالانکہ وہ مسیح یا اس کے کفارہ پر ایمان نہیں لائی تھی۔

باقی رہا یہ امر کہ اگر خدا کے بیٹے کے ذریعہ ہی گناہ معاف ہوسکتا ہے تو کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسیحؑ میں خدائی صفات بھی پائی جاتی تھیں؟ مثلاً ہم جب کہتے ہیں کہ خدا ہے تو اس کی ہستی کے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور وہ مختلف قوتیں اور طاقتیں جو انسان میں نہیں پائی جاتیں اس کی ہستی کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن مسیحی کوئی ایسی چیز پیش نہیں کرتے جو اور نبیوں میں تو نہ پائی جاتی ہو اور مسیح میں پائی جاتی ہو۔ بلکہ بہت سی باتیں بائبل میں نبیوں کے متعلق ایسی پائی جاتی ہیں جو مسیحؑ میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر یہ ایک الگ بحث ہے سوال یہ ہے کہ مسیحیت کی ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اور چونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اس لئے خدا کا بیٹا ہوگیا۔ ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا بیٹا کوئی اصطلاح ہے یا یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں عام طور پر یہ لفظ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ زید کا بیٹا یا عمرو کا بیٹا یا خالد کا بیٹا۔ یا اس کے کوئی اور معنی ہیں۔

جہاں تک اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنے کا تعلق ہے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس میں حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ

''ہاں اے باپ کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا۔ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے۔اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے'' (متی باب ۱۱ آیت ۲۶۔۲۷)

یہاں مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے۔ جہاں تک لفظوں کا تعلق ہے ہم مانتے ہیں کہ خدا کے بیٹے کے الفاظ انجیل میں مسیح کے متعلق آئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسیحؑ کو بیٹا کہنے کے وہی معنے ہیں جو جسمانی بیٹے کے ہوتے ہیں یا اس کے کچھ اور معنے ہیں۔

اسی طرح یوحنا باب ۳ آیت ۱۷ میں آتا ہے:۔

''خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے''

یہاں مسیحؑ نے پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی بات کہی ہے جو انجیل کے ایک دوسرے حوالہ کے خلاف ہے۔ یہاں وہ کہتے ہیں ''خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے۔لیکن دوسری جگہ لوقا باب ۲۰ آیت ۹ تا ۱۶ میں حضرت مسیحؑ ایک تمثیل بیان کرتے ہیں جو باغ کی تمثیل کہلاتی ہے۔اس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے باغ لگایا اور اسے کرایہ پر دے دیا۔جن لوگوں کو وہ باغ کرایہ پر دیا گیا تھا ان کے پاس باغ کے مالک نے اپنا نوکر بھیجا تا کہ وہ پھل کا حصہ دے دیں لیکن باغبانوں نے اسے مارا اور خالی ہاتھ واپس کر دیا۔ پھر اس نے ایک دوسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اس کو بھی پیٹ کر نکال دیا پھر اس نے ایک تیسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اس کو بھی مارا اور زخمی کر کے نکال دیا۔اس پر باغ کے مالک نے کہا اب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیجتا ہوں شاید باغبان اس کا لحاظ کریں اور باغ کا پھل اسے دے دیں۔لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا باغبانوں کے پاس آیا تو انہوں آپس میں مل کر یہ

فیصلہ کیا کہ آؤ ہم اسے قتل کر دیں تا کہ یہ باغ ہماری میراث ہو جائے اور پھر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہ رہے چنانچہ انہوں نے بیٹے کو باغ کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا۔

حضرت مسیحؑ یہ تمثیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں تم جانتے ہو پھر کیا ہو گا۔ پھر یہی بات رہ جائے گی کہ باغ کا مالک آپ آئے گا اور ان مالیوں کو نکال دے گا اور باغ کو کسی اور قوم کے سپرد کر دے گا۔ یہ تمثیل صاف بتاتی ہے کہ بیٹے کا آنا سزا کے لئے ہو گا چونکہ وہ لوگ باغ کا مالیانہ ادا نہیں کرتے تھے اس لئے خدا اپنے بیٹے کو بھیجے گا تا کہ ان پر حجت تمام کر کے انہیں سزا دے۔ پس یہ تمثیل مسیح کے اس قول کے بالکل خلاف ہے کہ ’’خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے‘‘

پھر متی میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ:۔

’’تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو‘‘ (متی باب ۲۸ آیت ۱۹)

اس کے علاوہ بھی بعض جگہوں پر حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھلانا چاہئیے کہ جہاں حضرت مسیح نے بعض جگہ اپنے آپ کو بیٹا بلکہ اکلوتا بیٹا کہا ہے وہاں اکثر مقامات پر اپنے آپ کو ابن آدم بھی کہا ہے۔ پس ہمارا کیا حق ہے کہ ہم ان کے ایک دعویٰ کو دوسرے دعویٰ پر فوقیت دیں۔ مسیح ہی کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور مسیح ہی کہتا ہے کہ میں ابن آدم ہوں۔ اور جب دونوں دعوے ایک شخص کے ہیں تو ان میں سے کسی ایک دعویٰ کو دوسرے دعویٰ پر فوقیت دے دینا ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یا تو دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن اللہ والی بات غلط ہے اور یا دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن آدم والی بات غلط ہے۔ بہر حال جب ایک شخص دونوں باتیں کہتا ہے تو محض اپنی عقل سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں بات سچی ہے اور فلاں بات غلط۔ انجیل میں لکھا ہے:۔

''ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اس لئے کہ خدمت کرے''

(متی باب ۲۰ آیت ۲۸)

مثیل مسیحؑ یعنی بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

''منہ از بہر ما کرسی کہ ماموریم خدمت را''

یعنی میرے لئے کرسی نہ رکھو کہ مجھے خدا نے دنیا کی خدمت کے لئے مامور کیا ہے۔ چونکہ دنیا میں عام طور پر لوگ غرباء سے کام لیتے ہیں اور ان پر کئی قسم کے مظالم کرتے ہیں۔ اس لئے مسیح نے کہا ہے۔ کہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ وہ خدمت لے بلکہ اس لئے آیا ہے کہ خدمت کرے۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال ہے یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے کہ انسان کو ظلم نہین کرنا چاہئیے اور دوسروں کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرنی چاہئیے لیکن جہاں تک یہ سوال ہے کہ مسیحؑ کیا تھا؟ اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ آدم کا بیٹا تھا۔

پھر لکھا ہے:۔

''جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابنِ آدم کے آنے کے وقت ہوگا''

(متی باب ۲۴ آیت ۳۸)

اسی طرح اس باب کی چوالیسویں آیت میں لکھا ہے۔

''جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا ابنِ آدم آجائے گا''

یعنی مسیح کی پہلی آمد بھی ابن آدم کی حیثیت میں تھی اور جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم کی حیثیت میں آئے گا۔ مگر وہ ایسا اچانک آئے گا کہ لوگوں کو اس کی آمد کا گمان بھی نہ ہوگا۔ یعنی جس طرح خدا تعالیٰ کے انبیاء آتے ہیں اور لوگ ان کی آمد کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے انہیں جھوٹا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح مسیحؑ کے ساتھ ہوگا۔

پھر لکھا ہے:۔

''فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو بلکہ اس خوراک کے لئے جو ہمیشہ کی زندگی تک باقی رہتی ہے، جسے ابن آدم تمہیں دے گا'' (یوحنا باب ٦ آیت ٢٧)

یعنی لوگ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں روٹی کپڑا ملے لیکن تمہیں ان چیزوں کے لئے کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ اس خوراک کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے جو حقیقی زندگی بخشتی ہے اور جو ابن آدم یعنی مسیح سے حاصل ہوتی ہے۔ باقی چیزیں تو سب فانی اور عارضی فائدہ پہنچانے والی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس تعلیم کے باوجود سب سے زیادہ حضرت مسیحؑ کی امت نے ہی دنیا کمانے کی طرف توجہ کی ہے اور سب سے زیادہ انہوں نے ہی روحانیت کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔

پھر لکھا ہے:۔

''اے یہودہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے۔'' (لوقا باب ٢٢ آیت ٤٨)

یہودہ حضرت مسیح کا ایک شاگرد تھا جس نے تیس روپوں کے بدلے انہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ مسیحؑ ان دنوں چھپتے پھرتے تھے اور وہ اور ان کے شاگرد ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے اور منہ کو بھی ڈھانک کر رکھتے تھے۔ تا کہ حضرت مسیح کا ان کو پتہ نہ چل جائے۔ (یوحنا باب ٢١ آیت ٤) دشمن بھی آپ کی تلاش میں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ہمیں پتہ لگ جائے کہ ان میں سے مسیحؑ کون سا ہے۔ آخر انہوں نے تیس روپے رشوت دے کر حضرت مسیحؑ کے ایک شاگرد کو جس کا نام یہودہ تھا اپنے ساتھ ملا لیا اور اس نے کہا تم میرے ساتھ چلو۔ جہاں سب اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوں گے وہاں آگے بڑھ کر میں جس شخص کا بوسہ لوں تم سمجھ جانا کہ وہی مسیح ہے اور اسے گرفتار کر لینا۔ اِدھر حضرت مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت الہام کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ تمہارا فلاں شاگرد اس طرح غداری کرے گا۔ چنانچہ جب یہودہ دشمن کے

سپاہی لے کر وہاں پہنچا اور وہ آپ کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا تو حضرت مسیحؑ نے کہا ''اے یہودہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے'' (لوقا باب ۲۲ آیت ۴۸)

گویا مسیح جب آیا تب بھی ابن آدم تھا جب دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم ہوگا اور جب صلیب پر لٹکایا گیا تب بھی وہ اپنے قول کے مطابق ابن آدم ہی تھا۔

پس جب مسیحؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہتا ہے تو خدا تعالیٰ کے بیٹے کے ایسے معنے کرنے جو توراۃ اور انجیل کی تعلیم کے خلاف ہوں کس طرح جائز ہو سکتے ہیں۔ایسی صورت میں یا تو ہم یہ کہیں گے کہ حضرت مسیحؑ نعوذ باللہ فاتر العقل لوگوں کی طرح کبھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیتے تھے اور کبھی ابن آدم کہنے لگ جاتے تھے اور یا پھر ہمیں اس کا کوئی حل نکالنا پڑے گا اور ان میں سے ایک کو استعارہ اور دوسرے کو اصل قرار دینا پڑے گا۔اگر ہمیں پتہ لگ جائے کہ استعارہ کونسا ہے اور اصل کونسا تو ہم بڑی آسانی سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔اگر ابن آدم استعارہ ہو تو پھر ابن اللہ کو اصل ماننا پڑے گا اور اگر ابن اللہ استعارہ ہو تو پھر ابن آدم کو اصل ماننا پڑے گا اور اگر ابن اللہ استعارہ نکل آئے تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی پر جو کفارہ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ساری کی ساری غلط ہے۔اس نقطہ نگاہ سے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس مسیح کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ:۔

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے''

(متی باب ۵ آیت ۹)

یہاں حضرت مسیحؑ اپنے سوا دوسرے انسانوں کو بھی خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔جس سے معلوم ہوا کہ خدا کا بیٹا کہلانا انسان کو خدا نہیں بنا دیتا۔اگر کسی شخص کو خدا کا بیٹا ماننے سے اس میں خدائی تسلیم کرنی پڑتی ہے تو پھر وہ تمام لوگ جو صلح کراتے ہیں اس حوالہ کے مطابق خدائی کے دعویدار بن سکتے ہیں اور تمام کے تمام اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ کفارہ دے

سکیں۔اس حوالہ سے صرف یہ نہیں نکلتا کہ حضرت مسیحؑ کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اس طرح جو حق مسیح کا سمجھا گیا تھا کہ وہ لوگوں کے لئے کفارہ ہوسکتا ہے باطل ہو جاتا ہے بلکہ اس سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے حضرت مسیح اس حوالہ میں یہ کہتے ہیں کہ

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے''

اس جگہ لوگوں کو صرف خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا گیا بلکہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ کیوں خدا کے بیٹے کہلائیں گے اگر خالی خدا تعالیٰ کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو یہ پتہ نہیں لگ سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلانے کی وجہ کیا ہے۔ہوسکتا تھا کہ ہم کوئی وجہ پیش کرتے اور دوسرا کہہ دیتا کہ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔لیکن حضرت مسیح نے یہاں وجہ بھی بتائی ہے کہ کیوں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور وہ وجہ صلح کرانا بتائی گئی ہے۔آپ فرماتے ہیں مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلائیں گے۔گویا صلح کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلانے کی شرط رکھا ہے اور بتایا ہے کہ جو صلح کرواتا ہے وہ بڑا مبارک ہے کیونکہ صلح کرانے سے انسان خدا تعالیٰ کا بیٹا بن جاتا ہے۔اس حوالہ سے صرف یہی نہیں نکلتا کہ مسیحؑ کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ بلکہ ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے نہیں۔اگر انہیں بیٹا کہا گیا ہے تو پھر کسی چھوٹی وجہ سے کہا گیا ہے یہ وجہ ان میں موجود نہ تھی۔کیونکہ حضرت مسیحؑ خود کہتے ہیں کہ

''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں''(متی باب۱۰ آیت ۳۴)

گویا متی کا ایک حوالہ تو یہ بتاتا ہے کہ صلح کرانے کی وجہ سے انسان کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلانے کا حق ہوتا ہے اور دوسرا حوالہ یہ بتاتا ہے کہ یہ وجہ مسیح میں نہیں تھی اس لئے مسیحؑ خدا کا بیٹا نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح ایک اور حوالہ ہے جس سے دوسرے انسانوں کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ خود یہ بتاتے ہیں کہ میرا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ میں واقعہ میں خدا یا خدا کا بیٹا ہوں۔ یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۳۹ میں لکھا ہے حضرت مسیحؑ نے یہود سے کہا:۔

''جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں وہی میرے گواہ ہیں (یعنی میری سچائی معلوم کرنے کے لئے تمہیں باہر سے کسی شھادت کے معلوم کرنے کی ضروت نہیں۔ جو کام خدا تعالیٰ نے مجھ سے کروائے ہیں وہ اپنی ذات میں اس بات کی شھادت دے رہے ہیں کہ میں سچا اور راستباز انسان ہوں) لیکن تم اس لئے یقین نہیں کرتے کہ میری بھیڑوں میں سے نہیں ہو (یعنی چونکہ تم میری جماعت سے نہیں اس لئے تم میرے مخالف ہو) میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں (یعنی جو لوگ میری جماعت میں سے ہیں وہ میری آواز کو سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں) اور میں انہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں اور میں انہیں ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہوں اور وہ ابد تک کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہ لے گا۔ میرا باپ جس نے مجھے وہ دی ہیں وہ سب سے بڑا ہے اور کوئی انہیں باپ کے ہاتھ سے نہیں چھین سکتا۔ میں اور باپ ایک ہیں۔ (جب حضرت مسیح نے یہودیوں سے یہ بات کہی تو چونکہ آخری فقرہ یہ تھا کہ کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہیں سکتا اور پھر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ میں اور باپ ایک ہیں اور باپ سے مراد خدا تھا تو اس کے معنے یہ بن گئے کہ میں اور خدا ایک ہیں۔ اس سے یہودیوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص خدا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے اس فقرہ پر) یہودیوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے پھر پتھر اٹھائے یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں۔ ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگسار کرتے ہو (یعنی مسیحؑ نے ان سے کہا کہ میں لوگوں کو

نیکی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو حلم اور عفو کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو محبت الٰہی اور خدا ترسی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں بنی نوع انسان کی خود بھی خدمت کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی خدمت کرنے کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو جو کام خدا تعالیٰ نے میرے سپرد کئے ہیں ان میں سے بہتیرے کام میں نے کئے ہیں۔تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرا کونسا جرم ہے جس کی وجہ سے تم مجھے سنگسار کرنا چاہتے ہو؟) یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں (یعنی خدمت خلق اور غریبوں سے اچھا سلوک اور حلم اور عفو کی تعلیم اور رحم دلی یہ چیزیں نہیں جن کی وجہ سے ہم تجھے سنگسار کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہمارے سنگسار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنی زبان سے کفر کا کلمہ نکالا ہے) اور اس لئے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے (یعنی تو نے انسان ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا ہوں۔اس لئے ہم تجھے سنگسار کریں گے) یسوع نے انہیں جواب دیا۔کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو (یعنی کیا بائبل میں یہ بات درج نہیں خدا نے اپنے بندوں کو خدا کہا ہے؟) جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں۔آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے۔اس لئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں؟ (حضرت مسیحؑ کہتے ہیں تمہارے لئے بائبل میں خدا کا لفظ بولا گیا ہے مگر تم خدا نہیں ہو گئے نہ تم اس لفظ کی وجہ سے کافر بن گئے لیکن میرے لئے صرف بیٹے کا لفظ بولا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں کافر ہوں۔ جب مجھ سے پہلے لوگوں کے لئے خدا کا لفظ استعمال ہوا اور وہ کافر نہ ہوئے بلکہ یہ سمجھا گیا کہ یہ ایک استعارہ ہے جو استعمال کیا گیا ہے تو میرے لئے بیٹے کے لفظ کا استعمال کونسا قہر ہو گیا کہ تم نے مجھے کافر قرار دے دیا۔ یہاں حضرت مسیحؑ نے صاف طور

پر اقرار کیا ہے کہ بائبل میں جوان کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ بیٹے کے معنوں میں نہیں کیونکہ دوسروں کی نسبت خدا کا لفظ آیا ہے۔ مگر تم یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ واقعہ میں خدا بن گئے تھے۔ جب تم انہیں مشرک نہیں کہتے جب تم اس لفظ کے باوجود انہیں خدائی کا دعویٰ کرنے والے قرار نہیں دیتے تو مجھے کیوں کہتے ہو کہ میں نے یہ لفظ استعمال کر کے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے اور اسو جہ سے میں کافر اور سنگسار کئے جانے کے قابل ہوں) اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو (یعنی لفظی ہیر پھیر اور شرارتوں سے کام لینے کا کیا فائدہ؟ سوال یہ ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کے جلال کے اظہار کے لئے کرتا ہوں یا اس کے خلاف کرتا ہوں ۔ موحدوں والے کرتا ہوں یا مشرکوں والے کرتا ہوں ۔ اگر میں تمام کام موحدوں والے کرتا ہوں تو الہام میں اگر میرے متعلق خدا تعالیٰ نے بیٹے کا لفظ استعمال کیا ہے تو بہرحال اس کے کچھ اور معنے کرنے پڑیں گے اور ضروری ہوگا کہ اس بارہ میں کسی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل میرے کاموں کو دیکھا جائے) لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں۔ انہوں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا''

(یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۳۹)

اس حوالہ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ نے خود اپنے بیٹا ہونے کے معنے کر دئے ہیں اور بتایا ہے کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ واقعہ میں خدا کی خدائی مجھ میں آ گئی ہے یا میں بھی ایک خدا ہوں ۔ بلکہ جس طرح بائبل میں دوسرے لوگوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ خدا ہیں لیکن اس کے باوجود خدا نہیں بن گئے ۔ بلکہ یہ ایک استعارہ تھا جو استعمال ہوا۔ اسی طرح جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو یہ بھی ایک استعارہ ہوتا ہے ۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ میں واقعہ میں خدا بن گیا ہوں ۔

اس حوالہ میں یہود کی شریعت کی طرف جواشارہ کیا گیا ہے وہ ہمیں زبور میں ملتا ہے۔زبور باب ۸۲آیت ۱تا۸ میں آتا ہے:۔

''خدا کی جماعت میں خداموجود ہے وہ الٰہوں کے درمیان عدالت کرتا ہے (یعنی مومن لوگ خدا ہیں اوران خداؤں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے)تم کب تک بے انصافی سے عدالت کروگے اورشریروں کی طرف داری کروگے۔غریب اوریتیم کاانصاف کرو۔غمزدہ اورمفلس کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ۔غریب اورمحتاج کو بچاؤ۔شریروں کے ہاتھ سے ان کو چھڑاؤ۔وہ نہ تو کچھ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں وہ اندھیرے میں اِدھراُدھر چلتے ہیں زمین کی سب بنیادیں ہل گئی ہیں۔میں نے کہا کہ تم الٰہ ہواورتم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہوتو بھی تم آدمیوں کی طرح مروگے اورامراء میں سے کسی کی طرح گرجاؤگے۔اے خدااٹھ زمین کی عدالت کر۔کیونکہ تو ہی سب قوموں کا مالک ہوگا۔''

حضرت داؤدؑ کے انہی کلمات کی طرف حضرت مسیحؑ اوپر کے حوالہ میں اشارہ کرتے ہیں۔اس میں ایک تو یہ آیت ہے کہ

''وہ الٰہوں کے درمیان عدالت کرتا ہے''

پھرآیت ۴ اور۷ تو بالکل واضح ہیں یعنی یہ کہ ''میں نے کہا تھا کہ تم الٰہ ہواورتم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو''

اس جگہ حضرت داؤد یہ کہتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل تم سب الٰہ ہو۔تم سب خدا ہو اورتم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ باوجود اس کے کہ میں نے تمہیں خدا کہا ہے اورخدا کا بیٹا بھی کہا ہے تمہیں یادرکھنا چاہئیے کہ چونکہ تم نہ اصلی خدا ہواورنہ اصل میں خدا کے بیٹے۔اس لئے تم آدمیوں کی طرح مروگے۔یعنی خداتو مرتانہیں لیکن تم موت سے نہیں بچوگے۔تمہیں خدااورخدا کا بیٹا اس لئے کہا گیا ہے کہ تم

دنیا میں خدا کی طرح انصاف کرو گے اور خدا تعالیٰ کے قوانین لوگوں میں جاری کرو گے۔ پس چونکہ تم دنیا میں خدا کے مظہر ہو گے اس لئے استعارۃً تمہیں کبھی خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا گیا ہے۔

بعض لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء کے دلی خیالات کا نام ہی الہام ہوتا ہے وہ اس کتاب کو داؤد کی زبور کہتے ہیں۔ لیکن ہم قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اسے خدا تعالیٰ کا الہام سمجھتے ہیں اور ہمارے نقطہ نگاہ سے حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ لیکن آگے تشریح کر دی گئی ہے کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ واقعہ میں خدا یا خدا کے بیٹے بن جائیں گے۔ بلکہ خدا اور خدا کے بیٹے کہلانے کے باوجود یہ مریں گے بھی۔ یہ کھائیں گے بھی۔ یہ پہنیں گے بھی۔ صرف اس لئے ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے کہ یہ دنیا میں انصاف قائم کریں گے اور خدا تعالیٰ کے احکام پر لوگوں کو چلائیں گے۔ حضرت داؤد بنی اسرائیل کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا نے تم کو اپنا نام دیا ہے۔ خدا نے تم کو اپنا بیٹا قرار دیا ہے۔ تم کو بھی چاہئیے کہ نام کی وجہ سے اپنے کردار کا جائزہ لو۔ غریبوں سے انصاف کرو۔ کمزوروں کو اٹھاؤ۔ ستم رسیدوں پر رحم کرو۔ عفو اور درگزر سے کام لو اور خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا تو ان معنوں میں نہیں کہا تھا کہ سچ مچ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا سمجھتا تھا کیونکہ اپنے قول کے مطابق وہ اپنے آپ کو اسی طرح خدا تعالیٰ کا بیٹا سمجھتا تھا جس طرح داؤد نے بنی اسرائیل کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اسی طرح بائیبل میں اور کئی مقامات پر مختلف لوگوں کے متعلق خدا یا خدا کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں پس جن معنوں میں وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے انہی معنوں میں حضرت مسیحؑ نے بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام طور پر یہ دھوکا دیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کو خدا یا خدا کا

بیٹا اور معنوں میں کہا گیا ہے لیکن یوحنا کا حوالہ صاف بتا تا ہے ۔ کہ وہ اپنے آپ کو انہی معنوں میں خدا کا بیٹا کہتا تھا جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا تھا۔ اگر اور معنے ہوتے تو حضرت مسیحؑ کی دلیل باطل ہو جاتی ہے ۔ حضرت مسیح یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو بے شک خدا کا بیٹا کہا ہے لیکن بیٹا کہنے سے میں خدائی کا مدعی نہیں بن جاتا ۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو بھی خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسیحؑ کا دعویٰ اور قسم کا تھا تو یہ دلیل باطل ہو جاتی ہے ۔ یہودی کہہ سکتے تھے کہ پہلے لوگوں کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے مگر تم اپنے آپ کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہتے ہو ۔ مگر مسیحؑ کا اس حوالہ کو پیش کرنا صاف بتا تا ہے کہ مسیح اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے انہی معنوں میں میں بھی خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی ہوں ۔ اور جب مسیحؑ انہی معنوں میں خدا کے بیٹے ہوئے جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے تھے تو کفارہ دینے کا حق جیسے مسیح کو حاصل تھا ویسے ہی تمام اسرائیلی نبیوں کو اور ان کے مخلص مومنوں کو حاصل تھا ۔ اور اگر ان کو یہ حق حاصل نہیں تھا تو مسیحؑ کو بھی نہیں تھا ۔ کیونکہ کفارہ کی بنیاد مسیح کے ابن اللہ ہونے پر ہے اور میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ مسیحؑ بیٹا کہلانے میں منفرد نہیں بلکہ سینکڑوں انبیاء اور ہزاروں لاکھوں مومنوں کو بھی بائیبل میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے ۔

یہاں تک تو اس بات کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسیحؑ کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی تھا اور اسی لئے وہ کفارہ ہوا یہ بائیبل کی رو سے درست نہیں ۔ بے شک وہ بیٹا ہونے کا مدعی تھا مگر انہی معنوں میں جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے کہلائے اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی ابن آدم ہونے کا بھی مدعی تھا ۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسیحؑ کا ابن آدم ہونا اصل حقیقت تھی یا اس کا ابن اللہ ہونا اصل حقیقت ہے اور اس کے لئے ہم پھر اس کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

میں نے بتایا ہے کہ مسیح نے یہ تسلیم کیا ہے کہ میں انہی معنوں میں خدا کا بیٹا ہوں جن معنوں میں بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔اور جب مسیح کے اپنے قول سے یہ بات ثابت ہوگئی،تو معلوم ہوا کہ اگر مسیح کو کفارے کا حق حاصل تھا تو اُن کو بھی حاصل تھا اور اگر اُن کو حاصل نہیں تھا تو مسیح کو بھی حاصل نہیں تھا۔اب ہم ایک اور طرح اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔دنیا میں جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو اس کا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا استعارۃً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ واقعہ میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے رہا ہو۔اور چونکہ یہ دونوں امکان موجود ہوتے ہیں۔اس لئے فیصلہ کے لئے ہمیں بہرحال کوئی نہ کوئی رستہ نکالنا پڑے گا۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ کسی شخص کے متعلق ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیر ہے اور کسی کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ باز ہے۔لیکن ہم اصلی شیر کو بھی شیر ہی کہتے ہیں۔ہم اپنے بچہ کو چڑیا گھر لے جاتے ہیں تو ایک جانور جو پنجرہ میں بند ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کر کے ہم کہتے ہیں کہ یہ شیر ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے اگر کوئی بڑا بہادر اور دلیر انسان بیٹھا ہو تو اس کے متعلق بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیر ہے۔اب سوال یہ ہے کہ بچہ کس طرح پہچانتا ہے کہ وہ شیر اور ہے اور یہ شیر اور؟ بہرحال کوئی پہچان ہونی چاہئے جو اس فرق کو واضح کر سکے اور وہ پہچان اس طرح ہوتی ہے کہ بچہ نے جو نیچرل ہسٹری کی کتابیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ان میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ شیر کے پنجے ہوتے ہیں دم ہوتی ہے منہ اس طرح ہوتا ہے۔شکل اس طرح ہوتی ہے۔پس جب ہم کسی انسان کو شیر کہہ دیتے ہیں اور بچہ دیکھتا ہے کہ اس کی دم نہیں۔اس کے پنجے نہیں اس کی شکل آدمیوں کی سی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اسے شیر استعارہ کے طور پر کہا گیا ہے اور جب ہم چڑیا گھر کے شیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ وہی شیر ہے جس کی کتابوں میں تصویریں آتی ہیں۔اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص خدا کا بیٹا تھا اور ہم استعارۃً کلام کرتے

ہیں ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ حقیقتاً خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے تو اس وقت ہمارا سامع یہ کس طرح فیصلہ کرسکتا ہے کیا اس کو ہم نے جو خدا یا خدا کا بیٹا کہا ہے تو ہماری مراد استعارہ ہے حقیقت نہیں۔ اس کے لئے بہرحال کوئی نہ کوئی معیار ہونا چاہئیے تاکہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (الفتح ۱۱) اے محمد رسول اللہ ﷺ وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری بیعت نہیں کرتے بلکہ خدا کی بیعت کرتے ہیں **ید اللہ فوق ایدیھم** ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہاتھ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہوتا تھا خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا تھا اب اس آیت کے باوجود ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو خدا نہیں مانتے۔ کیوں نہیں مانتے؟ اس لئے کہ قرآن کریم نے بعض اور مقامات پر خدا تعالیٰ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کھاتا پیتا نہیں محمد رسول اللہ ﷺ کھاتے پیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند ۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کو اونگھ بھی آتی تھی اور نیند بھی آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بیوی کی ضرورت نہیں۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی نو بیویاں تھیں۔ گویا وہ باتیں جو خدا تعالیٰ میں نہیں ہوتیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ میں پائی جاتی تھیں اور وہ باتیں جو خدا میں ہوتی ہیں وہ محمد رسول الللہ ﷺ میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ پس جب خدا نے کہا **ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ** تو ہم نے سمجھ لیا کہ یہ استعارہ ہے ۔ یہ مراد نہیں کہ آپ واقعہ میں خدا بن گئے تھے۔ چنانچہ ہمارا عقیدہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہی ہے کہ آپ بشر تھے سوائے بعض جہلاء کے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو بشر قرار نہیں دیتے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا ایک دوست مجھ سے ملنے کے لئے آئے وہ ان پڑھ تھے مگر قرآن

کریم کی آیتیں بہت صاف پڑھتے تھے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ جس دوست کے ذریعہ مجھے احمدیت میں داخل ہونے کی توفیق ملی ہے وہ قرآن کریم نہایت اچھا پڑھتے تھے ان کے پاس رہنے کی وجہ سے میری زبان بھی صاف ہوگئی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میں ایک دفعہ اپنے بعض رشتہ داروں کی طرف گیا اور انہیں میں نے کہا کہ دیکھو رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ **انما انابشر مثلکم** (حم سجدہ ۷) میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگے دیکھو میاں یہ اچھی طرح سن لو، تم ہمارے رشتہ دار ہو۔ اس لئے ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم تمہیں ماریں لیکن اب تم چپ کر کے یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ یہ بات ہم نے کبھی نہیں سنی تھی کہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی آدمی ہیں۔ آج تم نے یہ بات کہہ دی۔ تو بعض جہلاء اس قسم کے بھی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا سمجھ دار طبقہ ہمیشہ یہی تسلیم کرتا چلا آیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانوں کے سردار ہیں۔ تمام نبیوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پیارے ہیں۔ لیکن بہرحال وہ انسان ہیں۔ پس مسیحؑ جب کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ وہ باتیں جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کیا وہ ان کا مدعی ہے؟

جہاں تک کھانے پینے کا سوال ہے عیسائی یہ کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسیح انسانی بھیس میں آیا تھا اس لئے وہ کھاتا پیتا تھا۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے لیکن کم از کم جو روحانی باتیں ہیں وہ تو خدا میں رہیں گی یہ تو نہیں کہ خدا اس دنیا میں آکر وہ کمالات بھی بھول جائے گا جو خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں پائے جانے چاہئیں۔ مرقس باب ۱۰ آیت ۱۷۔۱۸ میں لکھا ہے:۔

''اور جب وہ باہر نکل کر راہ میں جا رہا تھا تو ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس سے پوچھنے لگا کہ اے نیک استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ یسوع نے اس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔''

پہلی صفت خدا تعالیٰ کی اس کا نیک ہونا ہے کیونکہ عیب دار خدا نہیں ہوسکتا۔ پہلی ہی صفت جو خدا میں پائی جانی ضروری ہے مسیحؑ اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا''

میں اس جگہ دوستوں کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات سن کر عیسائیوں نے اب بعض مقامات سے بائیبل کو بدل ڈالا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کو متی میں اب اسطرح درج کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح نے اسے یہ جواب دیا کہ

''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے''(متی باب ۱۹ آیت ۱۷)

حالانکہ انگریزی بائیبلیں جو انگلستان میں چھپی ہوئی ہیں اور بائیبل کے وہ اردو ایڈیشن جو 1910ء سے پہلے کے ہیں۔ان سب میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اسے یہ جواب دیا کہ ''تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا'' حضرت مسیح موعود علیہ الصلاۃ والسلام نے اعتراض کیا کہ تم کہتے ہو مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا اس لئے وہ کفارہ ہوگیا۔حالانکہ یہ حوالہ صاف بتا رہا ہے کہ مسیح خدا نہیں تھا کیونکہ وہ تو اپنے نیک ہونے سے بھی انکار کر رہا ہے اور جب وہ خدا نہیں تھا تو کفارہ کس طرح ہوا۔گویا ایک طرف سے کفارہ باطل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے توحید ثابت ہوتی ہے۔عیسائیوں کو اور تو کوئی جواب نہ سوجھا۔انہوں نے بائیبل کے نئے اردو ایڈیشنوں میں اُن الفاظ کی بجائے یہ الفاظ لکھوائے کہ:۔

''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے''

گویا یہ ظاہر کیا کہ حضرت مسیحؑ نے اسے یہ جواب دیا تھا کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں سوال کر رہا ہے نیک تو صرف خدا ہے۔حالانکہ تمام انگریزی بائبلوں میں اور اردو کی تمام پرانی بائبلوں میں یہ الفاظ تھے کہ ''تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا'' اس قسم کی سترہ اٹھارہ تبدیلیاں ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات کے نتیجہ

میں عیسائیوں نے بائبل میں کی ہیں ۔ بہر حال کہنے والے نے یہی کہا ہے کہ اے نیک استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں ۔اور حضرت مسیحؑ نے کہا کہ ’’تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا‘‘

اس حوالہ سے دو باتیں نکل آئیں ۔اول خدا میں نیکی ہے کیونکہ بغیر نیکی کے وہ خدا ہی نہیں ہوسکتا ۔دوم مسیحؑ میں نیکی نہیں اوران دو باتوں کا یہ لازمی نتیجہ نکل آیا کہ چونکہ مسیح میں نیکی نہیں اس لئے وہ خدا نہیں ۔

اسی طرح متی باب ۲۴ آیت ۳۲ تا ۳۷ میں لکھا ہے:۔

’’اب انجیر کے درخت سے ایک تمثیل سیکھو جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک بلکہ دروازہ پر ہے (یعنی مسیح کی آمد ثانی) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہولیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی لیکن اس دن (یعنی مسیح کی آمد ثانی کے دن) اوراس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ‘‘

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسیح اپنے عالم الغیب ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت اس کا عالم الغیب ہونا بھی ہے۔پس جب مسیح کہتا ہے کہ میں علم غیب نہیں جانتا اور مستقبل کے حالات کا مجھے علم نہیں تو دوسرے الفاظ میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو میں حقیقتاً نہیں کہتا بلکہ صرف استعارۃً کہتا ہوں ۔ یعنی میری مراد صرف اتنی ہوتی ہے کہ میں خدا کا پیارا ہوں ۔

اسی طرح انجیل میں خدائے واحد کے لفظ پر بھی زور دیا گیا ہے ۔یوحنا باب ۵ آیت ۴۴ میں لکھا ہے:۔

''تم جوایک دوسرے سے عزت چاہتے ہواور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو''

عیسائیت ہمارے سامنے تثلیث پیش کرتی ہے لیکن مسیحؑ صاف طور پر خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو۔

اسی طرح یوحنا باب ۱۷ آیت ۳ میں لکھا ہے:۔

''اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔''

یہاں سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی۔ پہلا حوالہ جو یوحنا باب ۵ کا تھا اس کا ایک بودہ سا جواب مسیحی دے سکتے تھے اور وہ یہ کہ جب ہم خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد اقنوم ثلاثہ سے ہوتی ہے جس میں خدا باپ بھی شامل ہے خدا بیٹا بھی شامل ہے اور خدا روح القدس بھی شامل ہے اور وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ ''تین ایک ہیں اور ایک تین'' پس وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی تین کو ایک سمجھتے ہیں اور خدائے واحد سے مراد خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس کا مجموعہ ہے۔ اس جواب کو یوحنا کے اوپر کے حوالہ نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہاں مسیح کا ذکر خدائے واحد سے الگ کر کے کیا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

''اور ہمیشہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ تجھے خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں'' اس جگہ خدائے واحد کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس میں مسیح شامل نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مسیح سے علیحدہ ہو کر خدائے واحد بنتا ہے اس کے ساتھ مل کر نہیں اور توحید اسی کا نام ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے نہ بیٹے کو نہ روح القدس کو اور نہ کسی اور کو۔

غرض اس حوالہ نے بھی بتا دیا کہ بیٹے کا لفظ ایک استعارہ تھا جو مسیح کے متعلق استعمال کیا گیا تھا اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ خدا کا شریک تھا بلکہ یہ ویسا ہی ایک پیارا کلمہ تھا جیسے مائیں اپنے بیٹے کو کہتی ہیں کہ یہ میرا بیٹا میرے جگر کا ٹکڑا اور میرا دل ہے۔جس طرح بندوں کو حق حاصل ہے کہ وہ پیار میں اس طرح کلام کریں اسی طرح خدا کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بندوں سے پیار اور محبت کی گفتگو کرے۔دنیا میں بسا اوقات اپنے کسی عزیز یا دوست کے بچہ کو جب انسان دیکھتا ہے تو کہہ دیتا ہے تو میرا بچہ ہے۔اب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ بعد میں ورثہ کا دعویٰ کر دے اور کہے فلاں فلاں اس بات کے گواہ ہیں کہ اس نے ان کے سامنے مجھے اپنا بچہ قرار دیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں۔اسی طرح مائیں اپنے بچوں کا ذکر کرتی ہیں تو کہتی ہیں۔ہائے میرا کلیجہ۔ہائے میرا دل۔ہائے میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ وہ بچہ سچ مچ ان کا کلیجہ یا دل یا آنکھیں ہوتا ہے یا عورت مر جائے تو ساتھ ہی بچے کو بھی دفن کر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بچہ تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو اس عورت کا کلیجہ یا دل تھا۔کیا دنیا میں کبھی کسی نے ایسی حماقت کی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں۔اسی قسم کے الفاظ خدا تعالیٰ بھی اپنے پیاروں کے متعلق استعمال کر لیتا ہے اور بعض دفعہ ان کو اپنا بچہ کہہ دیتا ہے۔جیسے اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا یا جیسے اس نے اور کئی نبیوں کو کہا۔پس کسی کو بیٹا کہنے کے یہ معنے نہیں کہ اب خدائے واحد نہیں رہا نعوذ باللہ دو یا تین خدا ہو گئے۔

غرض یہ حوالہ بھی بتاتا ہے کہ مسیحؑ کے نزدیک خدا اور ہے اور وہ اور۔چنانچہ خدائے واحد کے وجود کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور مسیحؑ کا الگ ذکر کیا گیا ہے۔اگر مسیح خدا ہوتا تو اس کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔خدائے واحد میں باپ خدا بھی آ جاتا ،بیٹا خدا بھی آ جاتا۔مگر اسے خدائے واحد سے الگ کیا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے

وجود میں شامل نہیں۔ پس ان حوالوں سے ثابت ہوا کہ جب مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا تو اس سے مراد حقیقتاً بیٹا نہ تھا بلکہ اسے استعارہ کے طور پر بیٹا کہا گیا تھا۔

پھر مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ مسیحؑ خدا کی طرح بے جسم ہے۔ جب وہ اس دنیا میں آیا تو اس نے لوگوں کے لئے جسم اختیار کیا ورنہ خدا کے بیٹے کا کوئی جسم نہیں۔ جیسے باپ خدا کا کوئی جسم نہیں یا جیسے روح القدس خدا کا کوئی جسم نہیں۔ اسی طرح بیٹے کا بھی کوئی جسم نہیں۔ جب وہ اس دنیا میں آیا تا کہ بنی نوع انسان کے گناہوں کی خاطر صلیب پر لٹک جائے تو اس نے اپنے لئے ایک جسم اختیار کرلیا۔ گویا جسم اختیار کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بنی نوع انسان کے بدلہ میں پھانسی پر لٹک جائے اور ایک دفعہ موت اختیار کرے کیونکہ موت کو گناہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جب مسیحؑ نے دوسروں کا گناہ اٹھا لیا تو اس پر موت آنی لازمی تھی۔ مگر جب موت آ گئی تو اس کے بعد وہ سکیم جو بنی نوع انسان کے گناہ معاف کرانے کے لئے اختیار کی گئی تھی ختم ہوگئی۔ اب اگر عیسائیوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو ضروری تھا کہ مسیحؑ جب دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے ساتھ اس کا جسم نہ ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی غرض پوری ہو چکی تھی۔ بنی نوع انسان کے گناہ معاف ہو چکے تھے اور اب بیٹے کے تجسم کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ ویسا ہی کامل ہو چکا تھا جیسے خدا باپ کامل ہے مگر انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد بھی جب ان کے نزدیک مسیحؑ دوبارہ زندہ ہوا مسیح کے ساتھ اس کا جسم تھا اور وہ اسی جسم سمیت آسمان پر گیا یا بعض دوسری روایتوں کے مطابق اسی جسم کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر غائب ہوگیا۔ گویا صرف یہی نہیں کہ انجیل کے رو سے مسیحؑ قبر میں سے جسم لے کر نکلا۔ حالانکہ اسے جسم کے ساتھ نکلنا نہیں چاہیئے تھا۔ بلکہ آسمان پر بھی اس جسم کو لے گیا حالانکہ اب جسم کے کوئی معنے ہی نہیں تھے۔ جب تک وہ دنیا میں نہیں آیا تھا اس کا کوئی جسم نہیں تھا۔ پھر عارضی طور پر اس نے بنی نوع انسان کے گناہوں کو اپنے اوپر لینے کے لئے جسم اختیار کیا۔ اس کے بعد جب وہ غرض پوری ہو چکی تو

لازماً اس کے ساتھ اس کا جسم نہیں ہونا چاہئیے تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ دوبارہ جی اٹھنے کے بعد بھی وہ جسم سمیت اٹھا اور پھر آسمان پر بھی جسم سمیت گیا۔ اس طرح اس کی خدائی کی ساری عمارت گر جاتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیحؑ جو عیسائیوں کے نزدیک خدا باپ کے برابر ہے، وہ اب تک اسی جسم کے ساتھ آسمان پر بیٹھا ہوا ہے اور اس قید کے ساتھ مقید ہے اور پھر انجیل میں یہ بھی کوئی ذکر نہیں کہ وہ کب اس جسم سے الگ ہوگا۔ بلکہ انجیل سے تو یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی اسی جسم کے ساتھ آئے گا۔ کیونکہ لکھا ہے جب وہ آئے گا تو

''اس وقت لوگ ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ بادلوں میں آتے دیکھیں گے۔'' (یعنی اس کا دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں پہچانا جائے گا بلکہ کئی قسم کے شکوک وشبہات بھی اس کے متعلق پیدا کئے جائیں گے) (مرقس باب ۱۳ آیت ۲۷)

گویا انجیل یہ بتاتی ہے کہ وہ دوبارہ بھی لوگ اسی جسم کے ساتھ مسیحؑ کو آسمان سے اترتا دیکھیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ اب دوبارہ مسیحؑ پر موت نہیں آسکتی۔ کیونکہ پہلی موت اس پر کفارہ کے لئے آئی تھی جب وہ کفارہ ہو چکا تو اب دوسری موت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو عیسائیوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح اب ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں رہے گا اور وہ اس سے کبھی رہائی حاصل نہیں کرسکتا اور یا انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ تھیوری جو ان کے تجسم کے متعلق انہوں نے پیش کی تھی وہ باطل ہے کیونکہ اگر یہ تھیوری درست ہوتی تو صلیب کے واقعہ کے بعد انہیں جسم سے آزاد ہو جانا چاہئیے تھا مگر بجائے آزاد ہونے کے وہ بائبل کی رو سے اسی جسم کے ساتھ زندہ ہوئے اور اسی جسم کے ساتھ آسمان پر چلے گئے۔

پھر عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ مسیح کفارہ ہوگیا ہے اس دعویٰ کے ثابت کرنے سے پہلے یہ سوال حل کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا مسیحؑ کفارہ پر راضی تھا۔ ساری دلیل کفارہ کی یہی ہے کہ خدا لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرسکتا اور چونکہ وہ معاف نہیں کرسکتا اس لئے اس نے بنی نوع

انسان کے گناہوں کا کفارہ مسیح کو سزا دے کر قبول کرلیا۔ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر زید مقروض ہے اور بکر اس کا قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے تو زید کا قرضہ اتر جاتا ہے۔ بنی نوع انسان گناہ کر کے خدا تعالیٰ کے مقروض ہو گئے ہیں اور وہ بوجہ عادل ہونے کے ان کو معاف نہیں کرسکتا۔کیونکہ ان کے خیال میں عدل اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گناہگار کوضرورسزا دی جائے ۔پس اس کا علاج اس نے یہ کیا کہ اپنے بیٹے سے لوگوں کا قرضہ وصول کرلیا۔فرض کرو یہ بات ٹھیک ہے۔اگر چہ گناہ روپیہ کی طرح نہیں بلکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو سرطان کا پھوڑا نکلا ہوا ہو۔ایسے شخص کے متعلق اگر دس ہزار لوگ بھی یہ کہیں کہ یہ پھوڑا اسے نہیں نکلا بلکہ ہمیں نکلا ہوا ہے اور ہم اس کی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہیں تو وہ اس کی تکلیف کو نہیں اٹھا سکتے ۔اسی طرح دنیا میں اور کئی چیزیں ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جا سکتا اور گناہ بھی انہی چیزوں میں سے ہے ۔لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گناہ کا بدلہ دیا جا سکتا ہے اور عیسائیوں کی بات درست ہے۔تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی قرض کے بدلہ میں دوسرے سے زبردستی روپیہ چھین لینا جائز ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر الف کا قرضہ ب اپنی مرضی سے ادا کرے تو ایسا کرسکتا ہے لیکن اگر الف کا قرضہ ہم معاف نہ کریں اور ب کی جیب سے جبراً روپیہ نکال لیں تو ہم نے انصاف ہی نہیں کیا بلکہ ظلم کیا۔انصاف اس لئے نہیں کیا کہ ہم نے اس سے قرضہ وصول نہیں کیا جس سے وصول کرنا چاہیئے تھا اور ظلم اس لئے کیا کہ ہم نے جبر سے کام لیا اور دوسرے کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال لیا۔پس اگر مسیحؑ لوگوں کے گناہوں کا قرض ادا کرنے پر راضی ہو اور باقی باتیں بھی ثابت ہو جائیں تو ہمیں مان لینا پڑے گا کہ وہ کفارہ ہو گیا۔لیکن اگر باقی باتیں مسیحیت ثابت بھی کر دے جن کا ہم نے اوپر رد کیا ہے اور یہ ثابت نہ کرے کہ بنی نوع انسان کے گناہ کا بوجھ اپنی مرضی سے مسیح نے اٹھایا تو کفارے کا تمام گھروندا ختم ہو جاتا ہے۔کیونکہ جس کو کفارے کے لئے پیش کیا گیا ہے وہ کفارہ دینے پر

راضی نہیں تھا۔اس کے متعلق ہم انجیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارہ میں کیا بیان دیتی ہے۔

مرقس باب۱۴ آیت ۳۲ تا ۴۲ میں لکھا ہے:۔

''پھر وہ ایک جگہ آئے جس کا نام گتسمنی (Gethsemane) تھا اور اس نے (یعنی مسیحؑ نے) اپنے شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھے رہو جب تک میں دعا کروں۔اور پطرسؔ اور یعقوبؔ اور یوحناؔ کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا (یعنی حضرت مسیحؑ نے صرف تین ساتھی لئے اور علیحدگی میں دعا کرنے کے لئے چلا گیا) اور ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو (یعنی پہلے تو باقی شاگردوں کو پیچھے چھوڑا تھا اور صرف تین شاگرد اپنے ساتھ لئے تھے لیکن پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی وجہ سے طبیعت میں حجاب پیدا ہو اور پوری طرح گریہ وزاری نہ ہو سکے اس نے انہیں بھی کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو) اور وہ تھوڑا آگے بڑھا اور زمین پر گر کر دعا کرنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ پر سے ٹل جائے (یعنی صلیب پر لٹکنا جس کے ذریعہ سے اس نے تمام بنی نوع انسان کے گناہ اٹھانے تھے۔اس کے متعلق اس نے یہ دعا کی کہ اے خدا یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور دشمن مجھے صلیب پر نہ لٹکا دے) اور کہا اے ابا اے باپ تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے اس پیالہ کو میرے پاس سے ہٹا لے۔(ان الفاظ کے صاف معنے یہ ہیں کہ اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ پھانسی پر لٹکے۔اپنی مرضی سے وہ پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار نہیں تھا پھر اس نے کہا) تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو (یعنی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ صلیب پر نہ لٹکوں اور کفارہ نہ بنوں۔لیکن تو چاہتا ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں گویا مجھ سے زبردستی ایک کام لے رہا ہے۔اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بینکر اُس شخص سے تو قرضہ وصول نہ کرے جس نے روپیہ لیا ہو اور بازار جاتے ہوئے کسی کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال کر یہ سمجھ لے کہ اس کا قرضہ ادا ہو گیا ہے۔مسیح صاف الفاظ میں کہتا ہے

''تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو'' یعنی میں تو نہیں چاہتا کہ صلیب پر لٹکوں لیکن اگر تو لٹکانا چاہتا ہے تو مجھے منظور ہے) پھر وہ آیا اور انہیں سوتے پا کر پطرس سے کہا اے شمعون تو سوتا ہے کیا تو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا (پطرس کا اصل نام شمعون تھا۔ مسیحؑ نے اس کا نام پطرس رکھا جس کے معنے چٹان کے ہیں اور جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آئندہ زمانہ میں یہ شخص مسیحیت کے لئے چٹان ثابت ہوگا) جاگو اور دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے (یعنی چونکہ خدا کا منشاء ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں اس لئے میرا دل تو نہیں ڈرتا مگر جہاں تک بشریت کا تعلق ہے میرا جسم اپنی کمزوری محسوس کرتا ہے) وہ پھر چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا کی (یعنی پھر یہی کہا کہ اے خدا میری مرضی صلیب پر لٹکنے کی نہیں لیکن اگر تو لٹکانا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں) اور پھر آکر انہیں سوتے پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور وہ نہ جانتے تھے کہ اسے کیا جواب دیں (غرض مسیحؑ گھبراہٹ اور بے قراری میں بار بار آتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ میرے حواری اس مصیبت اور تکلیف کی گھڑی میں میرا ساتھ دے رہے ہیں یا نہیں۔ مگر وہ جب بھی آتے، حواریوں کو سویا ہوا پاتے) پھر تیسری بار آ کر ان سے کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ بس وقت آ پہنچا۔ دیکھو ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جاتا ہے۔ دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آ پہنچا ہے''

اس حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے ہرگز کفارہ نہیں ہوا۔ اس کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے اور صلیب پر اسے نہ لٹکنا پڑے پس جو کچھ ہوا زبردستی ہوا۔

اس بارہ میں دوسری گواہی لوقا کی ہے اس میں لکھا ہے:۔

''پھر وہ نکل کر اپنے دستور کے موافق زیتون کے پہاڑ کو گیا اور شاگرد اس کے پیچھے

ہو لئے اور اس جگہ پہنچ کر اس نے ان سے کہا دعا کرو کہ آزمائش میں نہ پڑو اور وہ ان سے بمشکل الگ ہو کر کوئی پتھر کا ٹپہ آگے بڑھا اور گھٹنے ٹیک یوں دعا کرنے لگا کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو(گویا یہ انجیل بھی مانتی ہے کہ مسیحؑ نے یہ کہا کہ میری مرضی تو اس میں نہیں لیکن اگر تیری مرضی مجھے صلیب پر لٹکانے کی ہی ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو کہ میں تو قرضہ دینا نہیں چاہتا لیکن اگر تو چھیننا چاہتا ہے تو چھین لے)اور آسمان سے ایک فرشتہ اس کو دکھائی دیا وہ اسے تقویت دیتا تھا (یعنی خدا کو فرشتہ تقویت دیتا تھا یہ ایسی بات ہے جیسے گھوڑے کو کوئی چوہا بلکہ اس سے بھی کوئی چھوٹی چیز سہارا دے) پھر وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو کر اور بھی دلسوزی سے دعا کرنے لگا۔(گویا فرشتے کی تقویت بھی کام نہ آئی اور وہ اس دعا میں مشغول ہو گیا کہ کسی طرح یہ صلیب کی مصیبت مجھ سے ٹل جائے)اور اس کا پسینہ گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں ہو کر زمین پر ٹپکتا تھا (حالانکہ وہ دن سخت سردی کے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ شمالی علاقہ میں مسیح رہتے تھے اور پھر اس وقت پہاڑی پر چڑھے ہوئے تھے مگر اس پریشانی کا ان پر اتنا اثر تھا کہ ایسی سخت سردی میں بھی دعا کرتے وقت ان کا پسینہ ٹپ ٹپ بہنے لگا اس دعا کے بعد وہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے چونکہ انسان کے لئے اپنا عیب بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کہیں دشمن کوئی طعنہ نہ دے دے اس لئے یہاں لوقا نے ایک عجیب بات لکھ دی ہے مرقس نے تو صاف طور پر بیان کر دیا تھا کہ اس شدت گھبراہٹ میں مسیحؑ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس آتے اور کہتے کہ اٹھو اور دعا کرو۔ مگر وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ لیکن لوقا کو خیال آیا کہ یہ تو بڑی بدنامی کی بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ مسیحؑ کے اچھے شاگرد تھے اتنی بڑی مصیبت میں بھی وہ نہ جاگ سکے اور باوجود اس کے کہ مسیح بار بار کہتے تھے کہ اٹھو اور دعا کرو، وہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اس بدنامی کے دھبہ کو دور کرنے کے لئے لوقا

لکھتا ہے)جب دعا سے اٹھ کر شاگردوں کے پاس آیا تو انہیں غم کے مارے سوتے پایا۔(گویا شدت غم میں وہ بالکل سو رہے تھے)اوران سے کہاتم سوتے کیوں ہو(لوقا کے نزدیک اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم غم کیوں کرتے ہواور شدت غم میں تم کیوں سو رہے ہو۔ گویاغم میں انسان سویا کرتا ہےاور جب غم نہ ہوتواٹھ کردعا کیا کرتا ہے۔صاف پتہ لگتا ہے کہ چونکہ لوقا کو یہ خیال آ گیا کہ پڑھنے والے کیا خیال کریں گے کہ یہ عجیب شاگرد تھے جواتنی بڑی مصیبت میں بھی سوئے رہے اس لئے اس نے یہ الفاظ لکھ دئے کہ وہ حواری شدت غم میں سوئے رہے تھے۔مسیحؑ نے ان سے کہا)اٹھ کردعا کروتا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔''

(لوقاباب۲۲ آیت ۳۹ تا۴۶)

اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ صلیب پرلٹکنانہیں چاہتا تھااور کفارہ کی ساری بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سےلوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں صلیب پرلٹکا۔ جب وہ اپنی مرضی سےصلیب پر ہی نہیں لٹکا تو کفارہ کس طرح ہوا؟

بعض دفعہ عیسائی کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں۔مسیح نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ ''تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو''ہم کہتے ہیں ٹھیک ہے ایک نبی سے یہ کب امید ہوسکتی ہے کہ خدا چاہےاوروہ نہ چاہے مسیحؑ نے بھی جب دیکھا کہ خدا کی مرضی اسی میں ہے کہ میں صلیب پرلٹک جاؤں تو اس نے خدا تعالیٰ سے کہا کہ اے خدا تیری مرضی پوری ہولیکن اس سے اتنا تو ثابت ہوگیا کہ وہ اپنی مرضی سے کفارہ نہیں ہوا۔اور کفارہ خدا تعالیٰ کی مرضی سےنہیں ہوتا۔ بلکہ کفارہ اگر ہوسکتا ہےتو کفارہ دینے والے کی مرضی سے ہوتا ہے۔مسیحؑ صاف طور پر کہتا ہے کہ میری مرضی نہیں کہ میں کفارہ پیش کروں یہ اور بات ہے کہ جبر کے بعد وہ تیار ہوگیا ۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ ڈاکو جنگل میں کسی مسافرکو پکڑ لیتے ہیں تو وہ ہنس ہنس کرانہیں روپیہ دینا شروع کر دیتا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے

کہ اگر میں بولا تو یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں روپیہ دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ سوال نہیں کہ خدا نے اسے جبراً ایک بات پر تیار کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات مسیح کی اپنی مرضی سے ہوئی؟ اگر اس کی اپنی مرضی سے ہوئی ہے تب تو کفارہ ہوا ورنہ نہیں۔ اور اوپر کے حوالہ جات بتا رہے ہیں کہ مسیحؑ نے صاف طور پر یہ کہا کہ میری مرضی نہیں کہ میں صلیب پر لٹکوں۔ پس جو کچھ ہوا جبر سے ہوا اور یہ چیز ایسی ہے جو کفارہ کو باطل ثابت کرتی ہے۔

بعض عیسائی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسیح کی عارضی حالت تھی بعد میں اس کی یہ کیفیت بدل گئی تھی۔ اس امر کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صلیب کے وقت مسیحؑ کی کیا حالت تھی۔ ساری انجیل میں عبرانی کا ایک ہی فقرہ محفوظ ہے جو مسیحؑ نے صلیب کے وقت بولا۔ اور وہ فقرہ یہ ہے کہ ''ایلی ایلی لما سبقتنی'' (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) یعنی جب مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑے گئے تو مسیحؑ نے نہایت ہی دردناک طور پر خدا تعالیٰ سے دعا کی ایلی ایلی اے میرے خدا اے میرے خدا لما سبقتنی تو کس وجہ سے مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ تو نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھ سے اپنے رحم و کرم کی نظر ہٹا لی۔ اس دعا سے بھی صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے صلیب پر نہیں لٹکا بلکہ آخری حالت میں بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور اس نے مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ گویا مسیح اس بات پر خوش نہیں تھا کہ اس کو صلیب پر لٹکایا جائے اور جب وہ اس بات پر خوش نہ تھا نہ صلیب سے پہلے اور نہ بعد۔ اور وہ یہ قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھا تو اس کا صلیب پر لٹکنا کفارہ کا موجب نہیں ہو سکتا۔

پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی حل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا مسیحؑ آدم کے گناہ سے خود پاک تھا کہ قابلِ کفارہ ہو؟ کفارہ کی تھیوری یہ ہے کہ انسان پاک نہیں

ہوسکتا کیونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اور وہ آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ نسل اپنے باپ کی وارث ہوتی ہے۔اس لئے جو آدم کی اولاد ہے وہ بہرحال اپنے باپ کے گناہ کی وارث ہے اس لئے اولاد آدم گناہ سے بچ نہیں سکتی اور نجات نہیں پاسکتی اور نہ کوئی گناہگار انسان دوسرے گناہگار کے لئے کفارہ ہوسکتا ہے۔اس لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا وجود ہوتا جو گناہگار نہ ہوتا اور اپنی مرضی سے لوگوں کے گناہ اٹھالیتا اور ان کی سزا خود برداشت کر لیتا تا کہ دوسرے لوگ گناہ کی سزا سے بچ جائیں۔اور یہ وجود مسیح ناصری تھا جو خدا کا بیٹا تھا۔اس نے تمام لوگوں کے گناہ اٹھالئے اور صلیب پر لٹک کر ان کے لئے کفارہ بن گیا۔یہ ہے کفارہ کی تھیوری۔اب اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مسیحؑ گناہ سے پاک نہیں تھا تو یہ ساری تھیوری ختم ہوجاتی ہے۔جب وہ گناہ سے پاک ہی نہیں تھا تو کفارہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔انبیاء کے متعلق عیسائی یہی کہتے ہیں کہ چونکہ وہ گناہگار تھے اس لئے کفارہ نہیں ہوسکتے تھے۔ابراہیم کفارہ نہیں ہوسکتا تھا،موسیٰ کفارہ نہیں ہوسکتا تھا،داؤد کفارہ نہیں ہوسکتا تھا،کیونکہ وہ خود گناہگار تھے اور گناہگار دوسرے گناہگار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔لیکن بائبل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ خود بھی پاک نہیں تھا تو دوسرے گناہگاروں کا وہ بھی بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

انسان کو گناہگار ثابت کرنے کی دلیل مسیحیت یہ دیتی ہے کہ وہ گناہ کرنے والے آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ وہ آدم کی نسل میں سے ہے۔اس لئے گناہگار ہے۔ہم کہتے ہیں مسیحؑ بھی حوا کے ذریعہ آدم کی اولاد میں سے تھا اور اس لئے وہ بھی گناہگار تھا۔مسیحی کہتے ہیں کہ انسان نے گناہ آدم سے ورثہ میں لیا ہے۔جب مسیح کا کوئی باپ نہیں تھا تو آدم کا گناہ اس کے ورثہ میں نہیں آیا۔ہم کہتے ہیں ورثہ باپ اور ماں دونوں سے مل سکتا ہے۔مثلاً اگر ماں کے اندر آتشک ہوتو بچے کے اندر بھی آتشک کا مادہ آسکتا ہے یا اگر ماں کو سل ہوتو بچے کے اندر بھی سل کا مادہ آسکتا ہے۔کئی مائیں مسلول ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان کی اولاد میں

بھی سل کا مادہ آ جاتا ہے۔اسی طرح ماؤں کو مرگی یا جنون کا مرض ہوتا ہے تو اولاد میں بھی مرگی اور جنون کا مرض آ جاتا ہے غرض دنیا کے حالات پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی، جسمانی یا روحانی عیوب جو ماں باپ میں ہوتے ہیں وہ ورثہ کے طور پر ان کی اولاد میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ صرف باپ سے ورثہ کے طور پر کوئی بات آ جائے اور ماں کی طرف سے نہ آئے بلکہ باپ اور ماں دونوں کا ورثہ ملتا ہے۔اس نقطہ نگاہ سے جب مسیح حوا کی اولاد میں سے تھا تو خواہ اس کا باپ کوئی نہ ہو تب بھی اس نے اپنی ماں سے ورثہ کا گناہ پالیا تھا اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح گناہگار تھا۔مسیح اسی صورت میں گناہ کے ورثہ سے بچ سکتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ وہ آدم اور حوا دونوں کی اولاد میں سے نہیں تھا۔ جب اس کا نہ باپ ہو نہ ماں ۔تب بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ورثہ کا گناہ نہیں پایا۔ اور یا پھر یہ ثابت ہو جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا۔تب حضرت مسیح ورثہ کے گناہ سے بچ سکتے ہیں کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسیحؑ حوا کی اولاد میں سے ہے جس نے گناہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مسیح گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا تھا۔گناہ صرف آدم نے کیا تھا تب بھی اگر مسیح کو حوا نے جنا ہوتا تب تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس میں گناہ کا مادہ نہیں آیا۔لیکن مسیح تو اس عورت کا بیٹا ہے جو حوا سے ہزاروں سال بعد ہوئی اور جو کئی ہزار واسطے حوا تک رکھتی تھی اس دوران میں ہزاروں دفعہ آدم کی اولاد نے حوا کی بیٹیوں کو چھوا پھر اور حوا کی بیٹیاں ہوئیں تو ان کو پھر آدم کی اولاد نے چھوا۔اس طرح کئی ہزار چکر کھانے کے بعد حضرت مریم پیدا ہوئیں ۔وہ اتنے ہزار چکر میں آدم کے گناہ کے اثر سے بچ کس طرح سکتی تھیں اگر تو وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے ہوتیں اور حوا بے گناہ ہوتیں تب بیشک یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ حوا بے گناہ ہے اور چونکہ مریم براہ راست بغیر کسی واسطہ کے حوا کی بیٹی ہے۔اس لئے گناہ کا مادہ اس میں نہیں آیا مگر وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے نہیں

بلکہ حوا کی ان بیٹیوں کی اولاد میں سے ہے جو ہزاروں دفعہ گناہوں سے ملوث ہو چکی ہیں۔ پس وہ عورت جو آدم کے گناہ کا حصہ لے چکی تھی کس طرح مسیح کے پاک ہونے کا موجب ہو سکتی تھی۔

پھر یہ بھی درست نہیں کہ حوا بے گناہ تھی بلکہ بائبل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حوا آدم سے بھی زیادہ گناہگار تھی۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

''اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا (یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بائبل میں سانپ سے مراد شیطان ہوتا ہے) اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا (گویا شیطان حوا کے پاس گیا اور اس نے چالاکی یہ کی کہ حوا سے جا کر یہ نہیں کہا کہ میں نے سنا ہے کہ فلاں درخت کا پھل کھانے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ممانعت آ چکی ہے بلکہ اس نے یہ کہا کہ کیا خدا نے یہ کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا) عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اسکے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو

پکارا اوراس نے کہا کہ تو کہاں ہے۔اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اُس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا۔عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس لئے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپائیوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور آدم سے اس نے کہا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔اس لئے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی سبزی اگائے گا۔تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔جب تک زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے اس لئے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے۔کیونکہ تو خاک ہے اور پھر خاک میں لوٹ جائے گا۔''

(پیدائش باب۳ آیت ۱تا۱۹)

یہ وہ واقعہ ہے جو بائبل میں آدم کے گناہ کے متعلق آتا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کا مقصود آدم کو ورغلانا تھا۔کیونکہ شیطان سمجھتا تھا کہ آدم کے وجود سے میری حکومت باطل ہو جاتی ہے حوا کا مقام ایسا نہیں تھا کہ شیطان کو اس سے خطرہ ہوتا۔پس اس کی اصل

غرض یہ تھی کہ آدم کو جنت سے نکالا جائے۔گویا اصل ساکن جنت آدم تھا۔حوا آدم کے طفیل پیدا ہوئی اور آدم کے طفیل ہی اسے جنت ملی۔پس شیطان کا اصل مقصد آدم کو بہکانا تھا۔مگر شیطان آدم کے پاس نہیں گیا بلکہ حوا کے پاس گیا اور اسے پھل کھانے پر آمادہ کیا اور پھر حوا نے آگے آدم کو پھل کھلایا اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور شیطان پہلے حوا کے پاس کیوں گیا جبکہ اس کی اصل غرض آدم کو بہکانا تھی؟اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی اصل غرض گو آدم کو بہکانا تھی مگر وہ ڈرتا تھا کہ اگر میں براہ راست آدم کے پاس گیا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا اور آدم میرے دھوکہ میں نہیں آئے گا۔اس لئے وہ پہلے حوا کے پاس گیا۔وہ سمجھتا تھا کہ حوا جلد قابو آجائے گی اور پھر حوا کے ذریعہ آدم کو ورغلانا آسان ہو جائے گا۔چنانچہ جب آدم سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ

''کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔''

تو آدم نے یہی جواب دیا کہ

''جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا''

یعنی آپ کی طرف سے یہ عورت مجھے تحفہ کے طور پر ملی تھی۔میں دھوکہ میں آ گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ عورت جو خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے یہ تو غلطی نہیں کر سکتی اور میں نے اس کے کہنے سے اس درخت کا پھل کھا لیا۔غرض آدم بھی یہی کہتا ہے کہ عورت نے مجھے بہکایا اور شیطان بھی پہلے حوا کے پاس ہی گیا اور اس نے اسے ورغلایا۔ان واقعات سے ظاہر ہے کہ

۱۔پہلے گناہ حوا نے کیا

۲۔حوا آدم سے زیادہ کمزور اور گناہ میں پھنسنے کے زیادہ قابل تھی۔اس لئے شیطان پہلے حوا کے پاس گیا حالانکہ اس کا اصل مقصود آدم تھا۔

۳۔ جونسل آدم اور حوا سے پیدا ہوگی اس میں ورثہ کے گناہ کی کمزوری اس اولاد سے کم آئے گی جو صرف حوا سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ آدم اور حوا کی اولاد نے کچھ باپ کا ورثہ لیا ہے اور کچھ ماں کا ورثہ لیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب طاقتور اور کمزور چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو وہ ایک درمیانی کیفیت پر آجاتی ہیں۔لیکن وہ اولاد جو خالص حوا سے پیدا ہوگی وہ لازماً گناہ کے زیادہ قریب ہوگی۔

جب یہ حالات ہیں تو مسیح صرف حوا سے پیدا ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی نسبت گناہ کے زیادہ قریب ہوگئے پس وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوسکتے۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طاقت میں ہے کہ حوا کی نسل میں سے نیک لوگوں کو پیدا کردے۔ہم اس بات کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ حوا کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا کردے جو ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوں۔لیکن کفارہ کی بنیاد اس بات پر نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بات داخل ہے یا نہیں کہ وہ حوا کی نسل سے نیک لوگوں کو پیدا کردے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہگار رہے اور یہ گناہ کا مادہ اس نے آدم سے ورثہ میں لیا ہے۔ ورنہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی قدرت کا سوال ہے ہمارا عقیدہ تو آدم کی اولاد کے متعلق بھی یہی ہے کہ اس میں سے بھی نیک لوگ ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کی طاقت کا ہی سوال ہو تو خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ حوا کی گناہگار اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے اور خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ آدم گناہگار کی اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے۔لیکن عیسائیوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو گناہگار ہو اس کی اولاد نیک ہی نہیں ہوسکتی اور جب ان کا یہ عقیدہ ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طاقت کا کیا سوال رہا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ حوا کی اولاد نیک بن سکتی ہے تو پھر ہم یہ کہیں

گے کہ خدا تعالیٰ میں یہ بھی طاقت ہے کہ وہ آدم کے نطفہ سے نیک اولاد پیدا کردے۔ایسی صورت میں نہ ورثہ کے گناہ پر زور دینے کی کوئی ضرورت رہتی ہے نہ گناہگاروں کی نجات کے لئے خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی کی ضرورت رہتی ہے گویا کفارہ کی تمام عمارت ایک آن میں منہدم ہو جاتی ہے۔عیسائی سیدھی طرح تسلیم کرلیں کہ خدا تعالیٰ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ گناہگار ماں باپ سے نیک اولاد پیدا کردے۔لیکن اگر وہ حوا کی اولاد کے متعلق تو خدا تعالیٰ کی طاقت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں اور آدم کی اولاد کے متعلق اس کی طاقت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو یہ خود ایک قابلِ اعتراض امر ہوگا۔بہر حال اصل سوال صرف اتنا ہے کہ خدا میں نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ اگر خدا تعالیٰ میں گنہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے تو خدا تعالیٰ میں گناہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے اور اگر خدا میں گناہگار باپ سے نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ میں گناہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں۔ بہر حال اگر وہ گناہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے تو گناہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے اور وہ گناہگار باپ سے نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا تو گناہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔

غرض مسیح اگر گناہگار ماں کے بطن سے نیک پیدا ہوسکتا ہے تو باقی لوگ بھی نیک ہو سکتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ مسیح سے زیادہ نیک ہو سکتے ہیں۔کیونکہ ان کے اندر باپ اور ماں دونوں کے اثرات ہیں۔

میں نے اوپر لاہور کے ایک پادری کا ذکر کیا ہے جو بعد میں سہارنپور مشنری کالج کا پرنسپل ہو گیا میری اس سے جو گفتگو ہوئی،اس کا ایک حصہ میں بیان کر چکا ہوں۔اب گفتگو کا دوسرا حصہ بیان کرتا ہوں۔اس پادری کا نام غالباً وڈ تھا میں نے اس سے کہا پادری صاحب

آپ یہ بتائیں کہ ٹھنڈے پانی اور گرم پانی کو اگر آپس میں ملائیں تو کیا ہوگا۔وہ کہنے لگا پانی سمویا جائے گا۔کچھ گرم پانی کی گرمی کم ہوگی اور کچھ سرد پانی کی سردی کم ہو جائے گی ایک درمیانی سی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔میں نے کہا اب یہ بتایئے شیطان پہلے آدم کے پاس گیا تھا یا حوا کے پاس؟ کہنے لگا حوا کے پاس۔میں نے کہا شیطان کا مقصود کیا تھا، کیا حوا کو بگاڑنا مقصود تھا یا آدم کو بگاڑنا مقصود تھا؟ کہنے لگا شیطان کا مقصود تو آدم کو بگاڑنا تھا۔میں نے کہا جب آدم مقصود تھا تو وہ براہ راست آدم کے پاس کیوں نہ گیا۔راستہ میں چکر کاٹنے کی اسے کیا ضرورت تھی؟اس نے کہا وہ براہ راست آدم کے پاس اس لئے نہیں گیا کہ اس نے سمجھا کہ حوا کمزور ہے اور میں اسے آسانی کے ساتھ ورغلا لوں گا۔اس کے بعد آدم کو یہ حوا خود بخود ورغلا لے گی میری ضرورت نہیں رہے گی۔میں نے کہا تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ حوا آدم سے کمزور تھی۔کہنے لگا ہاں۔میں نے کہا جب حوا آدم سے کمزور تھی اور گناہ کا ارتکاب پہلے اسی نے کیا اور اسی نے آدم کو ورغلایا تو وہ وجود جو صرف حوا سے پیدا ہوا وہ بے گناہ کس طرح ہو گیا؟ میں نے کہا آپ گرم اور ٹھنڈے پانی کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں سمجھ لیں کہ آدم کی مثال ٹھنڈے پانی کی سی تھی اور حوا کی مثال گرم پانی کی سی تھی۔ان دونوں کے ملنے سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ لازماً اتنی گناہگار نہیں ہوسکتی جتنی وہ اولاد گناہگار ہوسکتی ہے جو صرف حوا سے پیدا ہوئی ہے۔پس مسیح جو حوا سے پیدا ہوا وہ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ گناہگار تھا۔کہنے لگا کیا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا؟ میں نے کہا ہمارا اور آپ کا سارا جھگڑا ہی یہی ہے۔اگر مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو پھر آدم کو آپ بے شک گناہگار کہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ اس کی اولاد نیک ہوسکتی ہے ضروری نہیں کہ وہ گناہگار ہی ہو۔اب جو میں نے اس طرح پکڑا تو کہنے لگا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا،سونے میں سے سونا نکلتا ہے۔آدم چونکہ گناہگار تھا،اس لئے اس کی اولاد بھی ضرور گناہگار ہوگی وہ نیک نہیں ہوسکتی کیونکہ سونے میں سے سونا نکلتا

ہے۔میں نے کہا کہ تو پھر حوا کا بیٹا دوسروں سے زیادہ گناہگار ماننا پڑے گا کیونکہ حوا آدم سے زیادہ گناہگار تھی۔اس نے نہ صرف خود درخت کا پھل کھایا بلکہ آدم کو بھی کھلایا اوراسی طرح وہ دوہری گناہگار بنی۔اس پر وہ پھر جھنجلا کر کہنے لگا۔مٹی کی کان میں سے سونا نہیں نکلتا۔کان مٹی کی ہوتی ہے مگر اندر سے سونا نکلتا آتا ہے۔میں نے کہا تو پھر آدم کے متعلق بھی یہی نظریہ تسلیم کریں کہ گو وہ گناہگار تھا مگر اس کی اولاد میں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو نیک ہوں اور ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں۔

اب عیسائیوں کے لئے صرف ایک ہی پہلو رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ مسیحؑ کے متعلق وہ یہ کہیں کہ اس کے ماں باپ کے گناہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔وہ ابن اللہ تھا اور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا۔اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حوا کی نسل میں سے ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی نسبت کم گناہگار تھا یا زیادہ گناہگار تھا۔وہ بوجہ ابن اللہ ہونے کے گناہ سے پاک تھا۔گویا اس کا پاک ہونا ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے سبب سے نہیں تھا بلکہ ابن اللہ ہونے کی وجہ سے تھا۔اس پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ اگر مسیح کے بغیر باپ کے پیدا ہونے میں کوئی خاص حکمت نہیں تھی اور ابن اللہ ہونے کی وجہ سے اس نے ماں باپ کا اثر قبول نہیں کرنا تھا تو اگر اس کا باپ ہوتا تب بھی اس کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔اگر مسیح ایک شادی شدہ عورت کے گھر میں پیدا ہوتا اور اس کا باپ ہوتا تو پھر بھی اس نے آدم اور حوا کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔کیونکہ اس کی اصل حیثیت ابن اللہ کی تھی پھر خدا نے یہ کیا ظلم کیا کہ اس نے گناہگار تو ہونا نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے مسیحؑ کو ایسے رنگ میں پیدا کیا کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل ہو گیا اور جہاں بھی لوگ بیٹھتے یہی کہتے کہ نعوذ باللہ حلال زادہ نہیں جب اس نے نہ باپ کا اثر قبول کرنا تھا نہ ماں کا اثر قبول کرنا تھا تو اس جھگڑے کی ضرورت کیا تھی اور خدا نے مریم اور مسیح کو ایک گندے الزام کے نیچے رکھ کر کیوں تکلیف دی۔جب وہ ابن

اللہ تھااور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا تو اسے باپ اور ماں دونوں سے پیدا کرنا چاہئیے تھا تا کہ وہ اپنے زور سے پاک ہوتا اور ولدالزنا ہونے کے الزام سے بھی بچتا۔

اس جگہ مسیحی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم بھی تو اس کو بن باپ مانتے ہو آخر تم کس وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا اور دشمن کو اس پر یہ الزام لگانے کا موقع ملا کہ وہ ولد الزناء ہے۔تم کفارہ کو تو مانتے نہیں اور جو وجہ ہم پیش کرتے ہیں اس کو رد کرتے ہو۔ پھر تم کیوں کہتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی یہ وجہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ تھا کہ آئندہ ان کی اولاد میں پے در پے انبیاء آئیں گے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت زمین وآسمان کے قیام تک ان کی نسل میں رہے گی اور پھر پے در پے نبیوں کی معرفت یہ وعدہ دیا گیا تھا۔ یہ وعدہ صدیوں تک اس طرح متواتر پورا ہوا کہ موسوی سلسلہ کے لوگ دلیر ہو گئے اور انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے خدا تعالیٰ اولاد ابراہیمؑ کو نہیں چھوڑ سکتا اور موسوی سلسلہ سے نبوت اور بادشاہت باہر نہیں جا سکتی ۔اس کا نتیجہ یہ نکلنا شروع ہوا کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء کا انذار بیکار جانے لگا۔ نبی آتے اور وہ اپنی تعلیم پیش کرتے تو یہود ان کا مضحکہ اڑا دیتے۔ جیسے یرمیاہؔ وغیرہ آئے اور یہود نے ہنس کر ان کو رد کر دیا اور سمجھا کہ خدا نے یہ نعمت ہمیں ہمیشہ کے لئے دے دی ہے۔تب خدا نے انہیں بعض نبیوں کی معرفت یہ خبر دی کہ ایک کنواری بیٹا جنے گی یعنی وہ موعود آدھا اسرائیلی اور آدھا غیر اسرائیلی ہو گا یہ ایک انذار تھا۔جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر یہود نبیوں کی باتیں نہ سننے پر اسی طرح مصر رہے تو آئندہ وہ نبی آئے گا جو نہ باپ کی طرف سے اسرائیلی ہو گا اور نہ ماں کی طرف سے اسرائیلی ہو گا سو مسیح کے وجود میں وہ وعدہ پورا ہوا۔ مسیح بن باپ کے پیدا ہوا اور اس کے ذریعہ سے یہود کو نوٹس دے دیا گیا کہ آدھی نبوت ان سے لے لی گئی ہے۔ کیونکہ نسل ہمیشہ باپ سے چلتی ہے۔سو انہیں کہا گیا

کہ اب جو نبی آیا ہے وہ باپ کی طرف سے یہود میں سے نہیں ہے اگر اس کے انذار سے بھی یہود نے فائدہ نہ اٹھایا تو اگلا نبی بالکل ہی غیر اسرائیلی ہوگا گو ابراہیم کی نسل سے ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے وعدے تھے اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ بلاوجہ ان وعدوں کی برکات سے یہود کو محروم کر دے اس لئے اس نے متواتر انبیاء بھیجے جب یہود میں متواتر نبی آتے رہے اور ان کو یہ یقین کامل ہو گیا کہ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نبوت غیر اسرائیلیوں میں چلی جائے تو خدا تعالیٰ نے اپنے بعض انبیاء کی معرفت ایک ایسے رنگ میں انذار کیا جس کے بعد اگر ان کے اندر کچھ بھی ایمان ہوتا تو ان کو ہوش آ جانا چاہئیے تھا اور یہ سمجھ لینا چاہئیے تھا کہ اب ہماری شرارتوں کی وجہ سے ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مگر وہ پھر بھی نہ سمجھے اور اپنی شرارتوں پر مصر رہے۔ آخر خدا تعالیٰ نے اپنے انذار کے مطابق مسیح کو بن باپ پیدا کیا اور یہودیوں کو سمجھایا کہ آدھی نبوت تو ہم نے لے لی ہے اگر آئندہ بھی باز نہ آئے تو سزا کے طور پر نبوت کا باقی حصہ بھی لے لیا جائے گا۔ چنانچہ اب جو نبی آیا ہے یہ ماں کی طرف سے تو یہودی ہے مگر باپ کی طرف سے نہیں۔ لیکن آئندہ ایک بالکل غیر اسرائیلی نبی آئے گا گو وہ ابراہیم کی نسل میں سے ہی ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا جو بنو اسمٰعیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل میں سے نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ پس ہمارا مسیحؑ کو بن باپ ماننا قابل اعتراض نہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں بڑی حکمت ہے لیکن جو حکمت وہ بتاتے ہیں ہم نے اسے رد کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس طرح حضرت مسیحؑ بے گناہ نہیں بلکہ دوسروں سے زیادہ گناہگار ثابت ہوتے ہیں اور کفارہ بالکل باطل چلا جاتا ہے۔

مسئلہ کفارہ کے متعلق ایک اور قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا مسیح کے صلیب پانے سے دنیا کا کفارہ ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسیح کی صلیب کا واقعہ جس رنگ میں بائبل پیش

کرتی ہے اگر ہم اسے تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مسیحؑ نے واقعہ میں کوئی قربانی پیش کی تھی۔ کیونکہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ صرف ڈیڑھ دن کے قریب قبر میں رہا۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسیحؑ کی صلیب کا واقعہ ہوا اور اتوار کے دن صبح کے وقت وہ اٹھ بیٹھا۔ (مرقس باب ۱۶) جمعہ کے بعد کی رات سے ہفتہ کی شام تک چوبیس گھنٹے ہوئے اور ہفتہ کی شام سے اتوار کی صبح تک بارہ گھنٹے ہوئے۔ گویا انجیل کی رو سے مسیحؑ صرف ۳۶ گھنٹے قبر میں رہا۔ فرض کرو یہ عیسائی عقیدہ کہ مسیحؑ ڈیڑھ دن تک دوزخ میں رہا درست ہو تو بھی سوال یہ ہے کہ مسیحؑ کا ڈیڑھ دن قبر میں رہنا دنیا کے گناہوں کا کفارہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ عیسائی عقیدہ کے مطابق دوزخ ابدی ہے اور ہر انسان جو دوزخ میں ڈالا جائے گا ہمیشہ کے لئے ڈالا جائے گا۔ لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد خدا تعالیٰ دوزخیوں کو بھی معاف فرما دے گا اور انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ امه هاوية (القارعہ) یعنی دوزخ رحم مادر کی طرح ہے۔ جس طرح رحم میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد بچہ باہر آجاتا ہے اسی طرح دوزخی کچھ عرصہ دوزخ میں رہنے کے بعد اس میں سے نکل آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ لیکن عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ دوزخ ابدی ہے اور جو بھی اس میں جائے گا وہ اس میں سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔ اب ساری دنیا جو مسیح پر ایمان رکھتی ہے وہ کروڑوں کروڑ کی ہے اسی زمانہ میں ساٹھ ستر کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ عیسائی ہیں۔ اگر یہ ستر کروڑ آدمی دوزخ میں جاتا اور اس میں ابد تک رہتا تو ستر کروڑ کو ابدیت سے ضرب دیکر دیکھ لو کہ کتنا وقت بن جاتا ہے اور یہ تو صرف اس زمانہ کے عیسائیوں کی تعداد ہے اگر مسیح سے لیکر اس وقت تک کے ان تمام لوگوں کا شمار کیا جائے جو مسیح پر ایمان لائے تھے اور ایک انسانی نسل کی اوسط عمر ہم تیس سال فرض کر لیں اور دنیا کی اوسط عیسائی آبادی دس کروڑ مان لیں کیونکہ پہلے وہ تھوڑے تھے پھر لاکھ دو لاکھ ہوئے۔

پھر ستر اسی لاکھ ہوئے پھر کروڑوں کروڑ تک پہنچ گئے یہاں تک کہ ان کی ایک ایک زمانہ میں ستر ستر اسی اسّی کروڑ تک تعداد ہو گئی۔اس تمام تعداد کی اوسط اگر ہم صرف دس کروڑ رکھیں اور ایک صدی میں تین نسلیں فرض کریں تو اب تک ستاون عیسائی نسلیں دنیا میں گزر چکی ہیں۔ ستاون کو دس کروڑ سے ضرب دیں تو پانچ ارب ستر کروڑ آدمی بن جاتا ہے۔اب پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کی سزا کو ابدیت سے ضرب دے کر دیکھ لو تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔گویا اگر مسیح کفارہ نہ بنتا تو اس پانچ ارب ستر کروڑ نے ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ میں رہنا تھا اور یہ زمانہ اتنا بڑا تھا جس کی تعیین ہندسوں میں ہو نہیں سکتی۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو صرف ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کے ابدی عذاب کا کفارہ قبول کر لیا۔کہا جاتا ہے کہ مسیحؑ کو اس لئے صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔تا کہ اللہ تعالیٰ کے عدل پر کوئی حرف نہ آئے۔مگر یہ کیا عدل ہے کہ پانچ ارب ستر کروڑ ضرب ابدیت کا عذاب ڈیڑھ دن میں پورا کر لیا گیا۔گویا اور لوگ دوزخ میں پڑتے تو انہیں ابد الآباد تک دوزخ میں رکھا جاتا لیکن اپنے بیٹے کا سوال آیا تو اسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر کہہ دیا کہ چلو سب کا کفارہ ہو گیا۔یہ تو ویسی ہی مثال ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک گاؤں کے کچھ شرارتی لڑکے باہر کھیل رہے تھے کہ انہوں نے ایک مردہ گدھا دیکھا۔انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ ہم اسے پکا کر کھالیں زندہ کیا اور مردہ کیا۔گوشت تو ہے ہی۔چنانچہ انہوں نے مل کر گدھا پکایا اور کھا لیا۔گاؤں والے ایسی باتوں کو سخت برا سمجھتے تھے۔انہیں پتہ لگا تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ملاں کے پاس گئے اور اسے کہنے لگے کہ غضب ہو گیا۔آج لڑکوں نے مردہ گدھا پکا کر کھا لیا ہے ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کا کوئی عذاب ہم پر نازل ہو جائے۔ملاں نے کہا کہ یہ تو بڑے گناہ کی بات ہوئی ہے اب فوراً اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے ورنہ اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو جائے گا۔وہ پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے ملاں نے انہیں اور ڈرا دیا۔اس پر انہوں نے کہا کہ ملاں جی اس مشکل کا آپ ہی کوئی حل نکالیں ایسا نہ ہو کہ ہم

سب برباد ہو جائیں۔ملاں نے کہا کہ اچھا میں کتابیں دیکھوں گا اور پھر بتاؤں گا کہ اس کا کیا علاج ہے۔چنانچہ وہ سارا دن فقہ کی کتابیں دیکھتا رہا اور شام کو گاؤں سے کہنے لگا کہ لو بھئی مسئلہ نکل آیا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ ایک بڑا سا شہتیر کھڑا کر کے اس کے چاروں طرف روٹیوں کا ڈھیر لگانا شروع کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ ڈھیر شہتیر کے آخری سرے تک پہنچ جائے اور پھر وہ روٹیاں خدا تعالیٰ کے نام پر دے دی جائیں۔مطلب یہ تھا کہ وہ روٹیاں مجھے دے دی جائیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے نام پر جو کچھ دیا جاتا ہے ملاں کو ہی دیا جاتا ہے۔اس نے سمجھا کہ چلو اس طرح کچھ دن مفت روٹیاں کھا لیں گے اور جو باقی رہیں گی بیچ لیں گے گاؤں چھوٹا سا تھا اور لوگ غریب تھے۔انہوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش اڑ گئے اور کہا کہ ملاں جی ہم تو کفارہ دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔اس نے کہا نہ دو گے تو سارے دوزخ میں جاؤ گے۔فقہ میں یہی لکھا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔انہوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ایک لڑکا بولا کہ ملاں جی کا اپنا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل تھا۔انہوں نے کہا کہ سچ کہتے ہو؟ لڑکوں نے کہا کہ بالکل سچ ہے وہ ہمارے ساتھ تھا۔آخر انہوں نے مشورہ کیا کہ پھر ملاں جی سے پوچھنا چاہیئے شاید مسئلہ کی کوئی شکل بدل جائے۔چنانچہ وہ پھر ملاں جی کے پاس آئے اور کہنے لگے ملاں جی آپ کا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل تھا۔یہ سن کر ملاں جی کو فکر ہوا کہ اب تو مجھے بھی کفارہ دینا پڑے گا۔کہنے لگے اچھا میں پھر کتابیں دیکھوں گا۔چنانچہ کتابیں دیکھ کر کہنے لگے لو میاں یہ بھی مسئلہ نکل آیا ہے کہ اگر اتنی توفیق نہ ہو تو پھر شہتیر کو زمین پر ڈال کر اس پر ایک ایک پھلکا رکھ دیا جائے اور وہ چند پھلکے صدقہ میں دے دئے جائیں۔تو یہ تو میاں نور جمال والی بات ہوگئی کہ پانچ ارب ستر کروڑ کو عذاب دے دیا جائے تو ابدی طور پر عذاب دیا جائے۔لیکن جب اپنے بیٹے کا سوال آیا تو کہہ دیا کہ ہم انصاف سے کام لے رہے ہیں ہم اسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر

یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ساری دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔اورابھی تو دنیا جاری ہے پانچ سو یا ہزار سال تک بھی دنیا اور جاری رہی تو گو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب احمدیت کی وجہ سے اب عیسائیت دن بدن کم ہی ہوگی ترقی نہیں کرے گی لیکن ہمارے بڑھتے بڑھتے بھی تین چار ارب کا اس تعداد میں اوراضافہ ہوجائے گا۔مگراتنی بڑی تعداد کے گناہوں کے کفارہ کا جب سوال آیا تو کہہ دیا گیا کہ ہم نے اپنے بیٹے کو ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر سب سزا پوری کر لی ہےاور ہمارے عدل وانصاف کا تقاضہ پورا ہوگیا ہے۔اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ پانچ ارب ستر کروڑ کوتو ابدی عذاب دینے کا فیصلہ کرنا اور یہ کہنا کہ وہ دوزخ میں سے کبھی نکل نہیں سکیں گے اوراپنے بیٹے کے متعلق یہ کہہ دینا کہ چونکہ وہ ڈیڑھ دن جہنم میں رہ آیا ہےاس لئے سب لوگوں کی سزا معاف ہوگئی ہے۔تم اس تجویز کوکسی کے سامنے رکھ کر دیکھ لو۔مسیح اور خدا کا نام نہ لو۔اتنا کہو کہ ایک شخص تھا جس کے ذمہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب قرض تھا۔ لوگوں نے اس سے روپیہ کا تقاضہ کیا مگر وہ ادا نہ کر سکا آخر معاملہ عدالت میں گیا۔اس نے درخواست کی کہ یہ قرض مجھے معاف کردیا جائے۔مگر جج نے کہا کہ میں معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنا میرے عدل کے منافی ہے میں ایسی بےانصافی نہیں کرسکتا کہ تمہارے ذمہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہواور تمہیں سزا نہ دی جائے۔مگراس کے بعداس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ اس ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے بدلہ میں تم ڈیڑھ روپیہ دے دواور جب اس نے ڈیڑھ روپیہ دے دیا تو اس نے کہا کہ اب سارا قرض معاف ہوگیا ہے۔کیا دنیا کا کوئی بھی عقل منداس فیصلہ کومعقول قراردے گا؟ ہر شخص کہے گا کہ قاضی صرف بےایمان ہی نہیں بلکہ بڑا چالاک اور فریبی بھی تھا گویا اس کا الزام بڑھ جائے گا اور دنیا اسے عادل نہیں کہے گی بلکہ کہے گی کہ وہ بڑا ظالم تھا، بڑا چالاک تھا اور فریبی تھا۔کہ اس نے اپنے بیٹے سے ڈیڑھ روپیہ لے کر یہ فیصلہ کردیا کہ لوگوں کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا ہوگیا ہے۔اسی طرح کفارہ کی جوصورت بتائی جاتی ہے وہ خدا

تعالیٰ پر الزام کو بڑھانے والی ہے گھٹانے والی نہیں۔ اور اس قسم کے کھیل سے اس کا عادل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ غیر عادل ہونے کے علاوہ چالاک اور دھوکے باز ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر ڈیڑھ دن بھی اسے دوزخ میں کیوں رکھا؟

اگر کہو کہ انسان اور خدا میں بے انداز فرق ہے چونکہ انسان کی حالت اور ہے اور خدا تعالیٰ کی حالت اور ہے اس لئے انسان کو جتنا عذاب ابدی جہنم میں ملے گا وہی عذاب خدا تعالیٰ کے بیٹے کو ڈیڑھ دن میں مل گیا ہے۔ اس وجہ سے بنی نوع انسان کی ابدی سزا کے مقابلہ میں ابن اللہ کا صرف ڈیڑھ دن کے لئے جہنم میں جانا کوئی قابل تعجب امر نہیں، جو عذاب ان کو ابدیت میں ملنا تھا وہی مسیح کو ڈیڑھ دن میں مل گیا۔ یہ بھی ایک جواب ہے جو دیا جا سکتا ہے۔

اس کا رد یہ ہے کہ جب خدا اور انسان میں بے انداز فرق ہے اور عیسائی بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو بے انداز فرق کے لحاظ سے یہ انسانی طاقت میں ہی نہیں کہ وہ خدا اور اس کی مخلوق کے باہمی فرق کو سمجھ سکے، بے انداز چیز انسانی اندازوں سے باہر ہوتی ہے اور اندازہ ہمیشہ اسی چیز کا کیا جاتا ہے جو محدود ہو اور جس کا سمجھنا انسانی طاقتوں کے لحاظ سے ممکن ہو۔ اب بے اندازہ فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ ارب ستر کروڑ انسانوں کے مجموعی عذاب کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ڈیڑھ دن کے لئے دوزخ میں چلا گیا اور انسانوں کا کفارہ ہو گیا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ انسانی عذاب کی جو مقدار ہے وہ خدا تعالیٰ کو کتنے عرصہ میں مل سکتی ہے۔ حالانکہ جب انسان اور خدا میں ہے ہی بے انداز فرق تو وہ یہ اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں ڈیڑھ دن میں تمام عذاب خدا تعالیٰ کو پہنچ گیا ہے ایسی صورت میں تو اسے ایک منٹ کے لئے بھی دوزخ میں رکھنا درست نہ تھا بلکہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی اس کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ کیونکہ یہاں مقابلہ محدود طاقتوں والے انسانوں اور غیر محدود طاقتوں والے خدا کا ہے اور غیر محدود طاقت والے خدا کا

اندازہ محدود طاقت والے کے ساتھ کرنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ پھر تو ایک سیکنڈ کی تعیین بھی اس کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ بے انداز فرق کے لحاظ سے تو جتنی دیر آنکھ جھپکنے میں لگتی ہے اتنی دیر کا عذاب بھی خدا تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں ڈیڑھ دن کا اندازہ انہوں نے کہاں سے نکال لیا اور اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ غیر محدود طاقتوں والے خدا کے متعلق یہ کس طرح سمجھ لیا کہ اس نے ڈیڑھ دن میں وہ عذاب برداشت کر لیا جو انسان اربوں سال میں برداشت کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی سوال ہے کہ دوزخ میں گیا کون تھا ابن آدم گیا تھا یا ابن اللہ گیا تھا؟ اگر ابن آدم گیا تھا تو سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ابن آدم کی روح چونکہ بہرحال جسم سے پیدا ہوتی ہے اور وہ جسم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی روح دوزخ میں چلی گئی۔ لیکن وہاں تو کوئی اور روح تھی ہی نہیں۔ جسم بے شک انسان کا تھا لیکن اس میں ابن اللہ تھا اور ابن اللہ اگر جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو اسی وقت خدا بن جاتا ہے وہ اسی وقت تک ابن آدم کہلا سکتا ہے جب تک وہ جسم کی قید میں ہے جب وہ اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو اسی وقت ابن اللہ بن جاتا ہے اور جب وہ ابن اللہ ہو گیا تو اس کی حالت خدا کی سی ہو گئی اور جب اس کی حالت خدا والی ہو گئی تو اس کے دوزخ میں جانے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ کیا خدا کو بھی سردی گرمی لگتی ہے یا وہ بھی سردی سے آرام اور گرمی سے تکلیف محسوس کرتا ہے؟ انسان کی روح تو اگر دوزخ میں جائے گی تو وہ گرمی محسوس کرے گی۔ سرد مقام پر رکھی جائے گی تو سردی محسوس کرے گی مگر ابن اللہ جو خدا ہے اس کے لئے سردی اور گرمی کا کیا سوال ہے۔ دوزخ بھی اس کی پیدائش ہے اور جنت بھی اس کی پیدائش ہے نہ دوزخ اسے تکلیف پہنچا سکتی ہے اور نہ جنت اسے آرام پہنچا سکتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا پاؤں ڈالیگا اور وہ ٹھنڈی ہو جائے گی کیونکہ خدا تعالیٰ کے لئے دوزخ کوئی چیز ہی نہیں۔ پس اگر مسیح ابن آدم تھا اور اس میں

انسانی روح تھی تو دوزخ میں خدا نہیں گیا بلکہ انسان گیا اور اگر اس میں ابن کی روح تھی تو جونہی اس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہوئی وہ فوراً خدا کی طرح ہوگئی جب خدا کی طرح ہوگئی تو اب خواہ اسے دوزخ میں بھی لے جاؤ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی۔ آخر مسیح کی کوئی دوروحیں تو تھی نہیں کہ کہا جائے ایک اس میں آدمی کی روح تھی اور ایک خدا کی روح تھی۔ اس میں ایک ہی روح تھی جو ابن اللہ کی تھی اور جب وہ روح جسم کی قید سے آزاد ہوگئی تو اس کے لئے دوزخ دوزخ ہی نہ رہا۔ پھر اگر اس کو دوزخ میں بھی لے جاؤ تو وہاں اس کا جانا اس کے لئے کسی عذاب کا موجب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ مادی احساسات سے بالا ہے نہ اس پر دوزخ اثر کرتی ہے نہ جنت۔

عیسائی بعض دفعہ گھبرا کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ سب تمثیلی کلام ہے تم خواہ مخواہ اسے حقیقت پر محمول کرتے ہو۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو تمثیلی کلام سے نئے نئے مسئلے نہیں نکلا کرتے۔ اس صورت میں بھی کفارہ باطل ثابت ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جب تم حقیقت بیان نہیں کر رہے بلکہ تمثیل بیان کر رہے ہو۔ تو اس سے عجیب و غریب مسائل نکالنا اور ان پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دینا تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کے متعلق یہ کہیں کہ وہ سچ مچ شیر ہے اور جب کوئی شخص ہم سے پوچھے کہ اس کی دم کہاں ہے یا اس کے پنجے وغیرہ کہاں ہیں اور ہم کہیں کہ یہ تو تمثیلی کلام تھا تم نے خواہ مخواہ اسے حقیقی شیر سمجھ لیا۔ تو اس کے بعد ہمارے لئے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ ہم اسے حقیقی شیر ہی کہتے پھریں۔ اسی طرح اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو عیسائیوں کو ماننا پڑے گا کہ مسیح کو ابن اللہ بھی تمثیلی طور پر کہا گیا تھا اور اگر وہ تمثیلی طور پر ابن تھا تو پھر نہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھا سکتا تھا اور نہ ڈیڑھ دن دوزخ میں رہ سکتا تھا۔ یہ ساری کی ساری باتیں ہی باطل اور بے حقیقت ہوکر رہ جاتی ہیں۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ عیسائیوں کی ساری باتیں مان لینے کے

باوجود کہ کفارہ بھی کوئی ممکن چیز ہے اور مسیح ابن اللہ تھا کیا یہ بات ثابت ہے کہ وہ قربانی مسیح نے پیش کر دی تھی جسے کفارہ کا موجب کہا جاتا ہے؟ انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ مسیح نہ تو صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارے کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔ مسیح کا صلیب پر سے زندہ اتر آنا درحقیقت ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عیسائیت کی موت ہے۔ اگر مسیحؑ صلیب پر سے زندہ اتر آئے تھے تو عیسائیت کلی طور پر ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسیحؑ صلیب کے واقعہ کے بعد اپنی طبعی موت مر گئے تھے تو وہ غلط عقائد جو غیر احمدیوں میں پھیلے ہوئے ہیں سب کے سب ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا مسیحؑ کا صلیب پر سے زندہ اتر آنا عیسائیت کو ختم کر دیتا ہے اور مسیحؑ کا طبعی موت مر جانا (دین حق) سے الحاد کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر عیسائیت مر جاتی ہے تو اس میں بھی (دین حق) کی زندگی ہے اور اگر الحاد مٹ جاتا ہے تو اس میں بھی (دین حق) کی زندگی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دونوں کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ آپ نے مسیح کو صلیبی موت سے بچا کر ایک طرف مسیح کو لعنت سے بچایا اور دوسری طرف عیسائیت کو مار دیا۔ اُدھر مسیح کی طبعی موت ثابت کر کے (دین حق) کو الحاد سے بچا لیا۔ کیونکہ ایک ایسا نبی جس نے رسول کریم ﷺ سے فیض حاصل نہیں کیا جس نے آپؐ کے دین سے استفادہ نہیں کیا، جس نے آپؐ کے باغ سے خوشہ چینی نہیں کی اس کا (دین حق) میں آنا (دین حق) اور محمد رسول اللہ ﷺ کی نہ صرف ہتک ہے بلکہ ان کے کام کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو حملے کر کے عیسائیت اور الحاد دونوں کو ختم کر دیا۔ ایک دفعہ آپ نے مسیح کو زندہ کر کے عیسائیت کو ختم کیا اور دوسری دفعہ آپ نے مسیح کو مار کر اسلام سے الحاد کو ختم کیا۔ یہ اتنے بڑے کارنامے ہیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ نہ ابھی تک ہماری جماعت نے ان کارناموں کی طرف توجہ کی ہے اور نہ ان کی

اہمیت کو پوری طرح سمجھا ہے۔ باقی باتیں کہ مسیحؑ واقعۂ صلیب کے بعد کہاں گیا یہ ضمنی دلائل ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کیے ہیں۔ اصل چیز مسیحؑ کا صلیب سے زندہ اترنا ہے۔ اگر وہ صلیب پر سے زندہ اتر آیا ہے تو عیسائیت ختم ہے۔ چنانچہ اس بات کا اقرار خود مسیحی لوگ بھی کر رہے ہیں Mr.Criltandan جو کہ انٹر یونیورسٹی فیلوشپ آف لنڈن کے سیکرٹری جنرل ہیں انہوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۵۶ء کو لنڈن مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا

''اگر مسیحؑ کی وفات کے متعلق جماعت احمدیہ کا نظریہ درست ہے تو پھر عسائیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر فی الواقعہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو پھر عیسائیت کی ساری بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور ایسی صورت میں عیسائیت کی تمام عمارت کا زمین پر آرہنا یقینی ہے''

(الفضل ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء جلد ۱۰/۴۵ شمارہ ۲۷۸ ص ۴)

پس اگر مسیح طبعی موت مر چکا ہے تو مسلمانوں کا الحاد ختم ہے۔ اس طرح وہ تمام تانابانا جو انہوں نے بنایا ہوا ہے سب کا سب ٹوٹ جاتا ہے اور وہ غلط عقائد جن میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہو چکے ہیں سب کے سب باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر مسیح طبعی موت مر گیا ہے تو آنے والا مسیح امت محمدیہ میں سے ہوگا اور جب آنے والا امت محمدیہ میں سے ہوگا تو (دین حق) اور (دین حق کے ماننے والوں) کے لئے ایک بہت بڑا مطمح نظر قائم ہو جاتا ہے۔ وہ قومیں جن کی امیدیں مر جاتی ہیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ قومیں جن کی امیدیں نہیں مرتیں وہ کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ جب بھی وہ گرنے لگتی ہیں ان کی امیدیں پھر ان کو کھڑا کر دیتی ہیں۔ پھر ان کے اندر بیداری اور ہوشیاری پیدا کر دیتی ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہمارے لئے بڑے بڑے درجے حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں، لیکن جب کسی قوم کی امید کا پہلو مار دیا جائے تو وہ قوم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ

الصلوٰۃ والسلام نے دو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ایک طرف آپ نے مسیح کو صلیب سے اترنے کے بعد زندہ کر کے عیسائیت کو مار دیا ہے اور دوسری طرف آپ نے مسیح کو قرآن کریم کی آیات کے مطابق وفات یافتہ ثابت کر کے (دین حق) کو الحاد سے بچالیا۔ یہ کیسا شاعرانہ مضمون ہے کہ آپ نے مسیح کو زندہ کر دیا اور عیسائیت کو مار دیا اور مسیح کو مار دیا اور (دین حق) کو زندہ کر دیا۔ چونکہ عیسائیت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیح صلیب پر لٹک کر مر گیا اس لئے جب یہ ثابت ہو جائے کہ مسیحؑ صلیب پر مرا ہی نہیں بلکہ زندہ رہا اور زندہ اترا تو ساتھ ہی کفارہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ ایک سوال ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے کہ کیا مسیح صلیب پر لٹک کر فوت ہوا اور کیا اس نے وہ قربانی پیش کی جو کفارہ کا موجب ہو سکتی تھی؟ انجیل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ مسیح نہ صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارہ کہا جاتا ہے۔ اگر ہم انجیل پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کا اصل معجزہ جس پر مسیحیت کو ناز ہے اور جو مسیحیت کے ابتدائی آثار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے یوناہ نبی کا معجزہ ہے۔ صلیب کے واقعہ کے بعد ایک لمبے عرصہ تک عیسائی کمزور رہے۔ وہ کبھی کسی ملک میں بھاگ کر چلے جاتے تھے اور کبھی کسی ملک میں۔ عام طور پر وہ چھپ کر رہتے تھے۔ کیونکہ جب لوگوں کو ان کا پتہ لگتا، تو وہ ان پر مختلف قسم کے مظالم کرتے۔ ابتدائی مظالم کے سوا جو فلسطین میں یہودیوں کی طرف سے ہوئے۔ بعد میں یہ مظالم زیادہ تر مشرک قوموں خصوصاً رومیوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ ایک عیسائی یہ رٹ لگانے سے نہیں رہ سکتا تھا کہ مسیح اس دنیا کا بادشاہ ہے۔ مگر ادھر بادشاہت کا لفظ اس کی زبان پر آتا اور اُدھر رومیوں کو آگ لگ جاتی اور وہ فوراً مظالم شروع کر دیتے۔ اس زمانہ میں یہودیت کا حملہ کمزور ہو چکا تھا بلکہ بعض جگہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسیحی چھپتے تو ان کے ساتھ یہودی بھی چھپ جاتے تھے۔ چونکہ مذہب ملتا جلتا تھا اور یہودی بھی موسوی شریعت سے اتنے دور نہیں ہوئے تھے

جتنے آج کل ہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔اس لئے جس طرح ہم بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور غیر احمدی بھی نمازیں پڑھتے ہیں ،ہم بھی روزے رکھتے ہیں اور غیر احمدی بھی روزے رکھتے ہیں۔ہم بھی حج کرتے ہیں اور غیر احمدی بھی حج کرتے ہیں ہم بھی قرآن مانتے ہیں اور غیر احمدی بھی قرآن مانتے ہیں اور اگر کوئی شخص صرف ظاہری شکل دیکھے عقائد کے اختلاف پر نظر نہ ڈالے تو وہ یہی کہے گا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں میں کوئی فرق نہیں۔اسی طرح جو ایمان تورات پر مسیحیوں کو تھا ویسا ہی ایمان یہودیوں کو تھا۔جس طرح صدقہ وخیرات عیسائی کرتے تھے ویسے ہی صدقہ وخیرات یہودی کرتے تھے۔جس طرح تورات کی تعلیموں کو عیسائی قابل عمل سمجھتے تھے اسی طرح تورات کی تعلیموں کو یہودی قابل عمل سمجھتے تھے۔اور چونکہ تمام تعلیم میں دونوں مشترک نظر آتے تھے۔اس لئے جب رومی لوگ عیسائیت کے خلاف بھڑکے اور انہوں نے ظلم کرنے شروع کیے تو ساتھ ہی انہوں نے یہودیوں پر بھی ظلم کرنے شروع کر دیئے اور یہ خیال کیا کہ یہ بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔پس ابتدائے عیسائیت میں تو ظلم یہودیوں کی طرف سے ہوئے مگر پھر شکل بدل گئی اور جب رومی دکھ دیتے تو وہ عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اکٹھا دکھ دیتے تھے یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان میں سے یہودی کون ہے اور عیسائی کون ہے۔چنانچہ جب عیسائی بھاگ کر کہیں چھپتے تھے تو یہودی بھی ان کے ساتھ ہی چھپ جاتے تھے اور روما میں جو آثار پائے جاتے ہیں ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔مگر میں سمجھتا ہوں عیسائیوں نے یہ بڑی ہمت کی کہ باوجود اس کے کہ روم میں ان کی بڑی مخالفت تھی اور حکومت کی طرف سے ان پر شدید مظالم ہوتے تھے پھر بھی انہوں نے وہاں تبلیغ پر بڑا زور دیا۔چنانچہ روم میں ان کے بڑے بھاری مشنز قائم تھے۔وہاں ان کی تبلیغ کی وجہ سے لوگ مخالفت بھی کرتے ،ظلم بھی کرتے ، جائدادیں بھی چھین لیتے ۔مگر ظلم زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا ۔پہلے کچھ عرصہ مارتے پیٹتے اور پھر چھوڑ دیتے جیسے آج کل

ہندوستان میں ہندوؤں کو بعض مقامات پر جوش آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد خاموشی ہو جاتی ہے۔ پھر کسی اور علاقہ میں ظلم شروع ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں بھی خاموشی ہو جاتی ہے۔ ان کا بڑا مرکز ایک تو روم تھا دوسرا مرکز انطاکیہ تھا اور تیسرا مرکز اسکندریہ تھا۔ ان تینوں جگہ عیسائی پادریوں پر حملے ہوتے تھے اور دشمن انہیں یا تو مار دیتا یا زخمی کر دیتا۔ ان متواتر حملوں کی وجہ سے عیسائی بعض دفعہ اپنے گھروں یا محلوں میں چھپ جاتے یا بھاگ کر ارد گرد کے گاؤں میں چلے جاتے یا اپنی رہائش گاہ کے لئے زمین دوز جگہیں بنا لیتے۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ اپنی قبریں تہ خانوں میں بناتے تھے اور ان کے لئے زمین سے پتھر نکال کر لاتے تھے۔ ان پتھروں کے نکالنے سے جو زمین میں گڑھے بن جاتے تھے انہی کو صاف کر کے عیسائی ان میں رہنا شروع کر دیتے تھے۔ روم میں ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں عیسائی ایک لمبے عرصہ تک چھپے رہے اور جن کو کیٹا کومبز (cata combs) کہتے ہیں۔ ان میں ابھی تک ایسی تصویریں ہیں جو دینی روح قائم رکھنے یا اپنے شہداء کی یاد تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے کھینچی ہوئی ہیں۔ اسی طرح قبروں پر کئی جگہ کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان میں یہ ذکر ہے کہ یہ کس کی قبر ہے اور کس طرح شہید ہوا ہے۔ ان غاروں کا ایک حصہ میں نے بھی دیکھا ہے سارا تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ستر میل تک یہ علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ بہرحال ان کیٹا کومبز کے دیکھنے سے پرانی عیسائی تاریخ کا پتہ لگ جاتا ہے کیونکہ مسیحیت کے پھیلنے سے پہلے کے مظالم کا نقشہ ان آثار کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور کتبوں کی عبارات اور تصویروں سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت مسیحیوں کے کیا عقائد تھے۔ تیسری صدی مسیحی میں روم کا بادشاہ عیسائی ہو گیا تھا اور پھر مسیحیت کو طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے زمانہ سے تعلق رکھنے والی جس قدر باتیں ہیں ان کا پتہ انہی کیٹا کومبز کے دیکھنے سے لگتا ہے۔ ان کیٹا کومبز میں ہمیں زیادہ تر تین تصویریں

ملتی ہیں ایک نوح کی کشتی کی۔ایک گڈریا کی جس کے ارد گرد بھیڑیں ہیں اور ایک یوناہ نبی کی جسے مچھلی نگل رہی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تاریخ میں عیسائی مذہب کی بنیاد صرف تین چیزوں پر رکھی گئی یا یوں کہو کہ تین مسئلے تھے جو عیسائیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتے تھے۔گڈریا کی تصویر میں اس طرف اشارہ تھا کہ مسیحؑ یہود کی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے۔نوح کی کشتی کے یہ معنے تھے کہ مسیح ہمارا نجات دہندہ ہے اور یوناہ نبی کی تصویر سے وہ معجزہ مراد تھا جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔گویا ان تین تصویروں کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ مسیحیت کی بنیاد انہی تین باتوں پر ہے (۱) یہ کہ مسیح اپنی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے (۲) اس پر کہ مسیح نجات دہندہ ہے (۳) اس پر کہ مسیحؑ کو ویسا ہی معجزہ دیا گیا ہے جیسے یوناہ نبی کو دیا گیا تھا۔

پس مسیحیت کی بنیاد اس معجزہ پر ہے بلکہ مسیحیت اس کو ہی ایک حقیقی معجزہ قرار دیتی ہے اور تمام ابتدائی زمانہ کے نقوش اور تصاویر جن کا مسیحیت کے لٹریچر سے پتہ لگتا ہے وہ بھی اسی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ یعنی گڈریا کی تصویر جسے اپنی بھیڑوں سمیت دکھایا گیا ہے۔نوح کی کشتی کی تصویر اور یوناہ نبی کے مچھلی کے پیٹ میں جانے کی تصویر۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا اصل معجزہ یہی تھا خود مسیح بھی اسے اپنا منفرد اور اصل معجزہ قرار دیتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے حضرت مسیح وعظ کر رہے تھے کہ

"بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں (یعنی ہم ماننے کے لئے تو تیار ہیں لیکن دلائل سے ہماری تسلی نہیں ہوتی ہمیں کوئی نشان دکھایا جائے) اس نے جواب دیکر ان سے کہا اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن

زمین کے اندر رہے گا۔'' (متی باب ۱۲ آیت ۳۸ تا ۴۰)

مسیح نے اس سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں تم کو اور کئی نشان دکھا چکا ہوں۔ تم ان سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اسی طرح مسیحؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو کئی نشان دکھاؤں گا۔ بلکہ مسیح نے کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا ان کو اور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا یہ بتاتا ہے کہ مسیحؑ اپنے اس نشان کو ایک ہی نشان قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی نبی ایسا نہیں ہو سکتا جس نے ایک ہی نشان دکھایا ہو۔ خود انجیل سے ظاہر ہے کہ مسیحؑ نے اور بھی کئی نشان دکھائے ہیں۔ پس مسیحؑ کا یہ کہنا کہ ''یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا'' اس کے معنے یہ ہیں کہ جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے بنیادی نشان مسیح کو یوناہ نبی والا ہی دیا جائے گا۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں کی شہادت سے بھی یہی بات ثابت ہے اور درحقیقت ابتدائی زمانہ کا عیسائی ہی اس بات کا اہل تھا۔ کہ وہ سمجھتا تھا کہ عیسائیت کی کیا غرض ہے۔ ان کی تصویروں سے پہلی تصویر ہی یوناہ نبی کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو بتاتی ہے کہ ابتدائی زمانہ کے مسیحی یہ تسلیم کرتے تھے کہ یوناہ نبی والا نشان ہی مسیح کا اصل نشان ہے۔ باقی دو تصویریں اس پہلی تصویر کے تابع ہیں یعنی یوناہ نبی والے نشان میں ہی نجات بھی شامل ہے اور یوناہ نبی والے نشان میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا گڈریا والی مثال بھی شامل ہے۔ کیونکہ مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد اپنی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ایران اور افغانستان اور کشمیر گیا اور اس نے انہیں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اور پھر مسیح خود کہتا ہے کہ ایک ہی نشان ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو دکھایا جائے گا اور وہ یوناہ نبی والا نشان ہے ایک ہی نشان کے یہ معنے ہیں کہ یہ ایک ہی اہم نشان ہے اور ایک ہی قابل اعتماد نشان ہے۔ غرض ابتدائی زمانہ کا عیسائی بھی تسلیم کرتا ہے کہ عیسائیت کی حقیقی شان یوناہ نبی والے نشان سے ظاہر ہوتی ہے اور مسیح بھی اس کو اپنا منفرد اور مہتم بالشان نشان قرار دیتا ہے۔

لوقا میں بھی یہی ذکر آتا ہے اس میں لکھا ہے:۔

''اس زمانہ کے لوگ برے ہیں وہ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ٹھہرے گا'' (لوقا باب ۱۱ آیت ۲۹۔۳۰)

لوقا نے یہاں ایک زائد بات کہی ہے۔ متی نے تو یہ کہکر اپنی بات ختم کر دی تھی ''یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔'' یہاں متی نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ متی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''نینوہ کے لوگ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ انہوں نے یوناہ کی منادی پر توبہ کر لی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو یوناہ سے بھی بڑا ہے'' (متی باب ۱۲ آیت ۴۱) مگر لوقا اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ گویا اس نشان کے متعلق وہ خاص طور پر بتلاتا ہے کہ نینوہ کے لوگوں کے لئے جس رنگ میں یوناہ نشان ٹھہرا تھا اسی رنگ میں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مسیحؑ نشان ٹھہرے گا۔

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل نشان جو زمانۂ مسیحؑ میں دکھایا جانے والا تھا وہ یوناہ نبی والا نشان تھا۔ یہ نشان کیا تھا۔ اس کے متعلق مسیح خود کہتا ہے کہ:۔

''جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا''

اس جگہ حضرت مسیح نے خود تشریح کر دی ہے کہ یوناہ نبی کے نشان سے کیا مراد ہے۔ آپ

کہتے ہیں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ مشابہت کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ہر چیز میں مشابہت ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصولی باتوں میں مشابہت ہوگی۔ چنانچہ اسی مشابہت کی بناء پر مسیحؑ کہتا ہے کہ جس طرح یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا اسی طرح مسیح قبر میں تین دن رات رہے گا۔ گویا اس نشان کا مقصد یہ تھا کہ مسیح بھی تین دن رات قبر میں رہے اور یوناہ نبی کی طرح خدا تعالیٰ کی حفاظت میں رہے آخر کسی کا مچھلی کے پیٹ میں چلے جانا تو کوئی معجزہ نہیں۔ ہزاروں لوگ مچھلی کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں کہتا کہ یہ معجزہ ہوا ہے پھر یوناہ نبی کا کیا معجزہ تھا؟ یوناہ نبی کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں خدا تعالیٰ کی حفاظت میں رہا۔ تا کہ اس کی قوم کے لئے اس کا وجود خدا تعالیٰ کا ایک نشان ثابت ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یوناہ نبی کس طرح مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا۔ اس کے لئے ہم یوناہ نبی کی کتاب کو دیکھتے ہیں اس میں لکھا ہے:۔

''خداوند کا کلام یوناہ بن متی پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کے خلاف منادی کر کیونکہ ان کی شرارت میرے حضور پہنچی ہے (نینوہ ایک بڑا شہر تھا خدا تعالیٰ نے یوناہ سے کہا جاؤ اور ان لوگوں کو سمجھاؤ) لیکن یوناہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو بھاگا اور یافا میں پہنچا اور وہاں اسے ترسیس کو جانے والا جہاز ملا۔ اور وہ کرایہ دے کر اس میں سوار ہوا تا کہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو اہل جہاز کے ساتھ جائے (یعنی بجائے اس کے کہ وہ اور نبیوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے اور نینوہ والوں کو تبلیغ کرتے ان کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے پہلے اس کی طرف سے عذاب کی خبریں ملتی ہیں اور پھر لوگوں کے تضرع پر وہ ان کو معاف کر دیتا ہے اور لوگ نبیوں کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں نینوہ میں جاتا ہی نہیں۔

چنانچہ وہ ترسیس جانے کے لئے جہاز میں سوار ہوگئے۔) لیکن خداوند نے سمندر پر بڑی آندھی بھیجی اور سمندر میں سخت طوفان برپا ہوا اور اندیشہ تھا کہ جہاز تباہ ہو جائے۔ تب ملاح ہراساں ہوئے اور ہر ایک نے اپنے دیوتا کو پکارا اور وہ اجناس جو جہاز میں تھیں سمندر میں ڈال دیں تا کہ اسے ہلکا کریں (پہلے زمانہ میں بادبانی جہاز ہوتے تھے جو زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے اس لئے جب طوفان آتا اور جہاز ڈوبنے کا خطرہ ہوتا تو وہ اپنے سامان کا کچھ حصہ سمندر میں پھینک دیتے تا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے) لیکن یوناہ جہاز کے اندر پڑا سو رہا تھا (باقی لوگ تو دعائیں کر رہے تھے اور جہاز کا بوجھ ہلکا کر رہے تھے اور یوناہ اندر سو رہے تھے) تب ناخدا اس کے پاس جا کر کہنے لگا تو کیوں پڑا سو رہا ہے اٹھ اپنے معبود کو پکار شاید وہ ہم کو یاد کرے اور ہم ہلاک نہ ہوں اور انہوں نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب سے آئی۔ چنانچہ انہوں نے قرعہ ڈالا اور یوناہ کا نام نکلا۔ تب انہوں نے اس سے کہا۔ تو ہم کو بتا کہ یہ آفت ہم پر کس سبب سے آئی ہے۔ تیرا کیا پیشہ ہے اور تو کہاں سے آیا ہے۔ تیرا وطن کہاں ہے اور تو کس قوم کا ہے اس نے ان سے کہا میں عبرانی ہوں (ضمنی طور پر ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے یوناہ عبرانی نہیں تھا بلکہ کسی اور قوم کا نبی تھا۔ کیونکہ وہ نینوہ والوں کی طرف بھیجا گیا تھا جو کہ اسؔور کا دارالخلافہ تھا اور وہاں کے لوگ اشور قوم کے تھے۔ اشور سے مراد سیریا یعنی شام کا علاقہ نہیں بلکہ یہ الگ علاقہ ہے اور شہر بابل کے شمال سے شروع ہو کر آرمینیا کی سرحد سے جا ملتا ہے اور مشرقی طرف اس کی کردستان سے ملتی ہے اور مغربی سمت دجلہ کے مغرب کے علاقہ کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ گویا موجودہ عراق کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔ ایک زمانہ میں اس علاقہ میں زبردست حکومت قائم تھی۔ اس کا دارالخلافہ پہلے اسؔور تھا جو موصلؔ سے ساٹھ میل جانب شمال واقع تھا اور اب اسے قلعات شرجت کہتے ہیں۔ لیکن تیرہ سو سال قبل مسیح اس شہر کو چھوڑ کر نینوہ کو دارالحکومت قرار دیا گیا۔

محققین یورپ بھی اس بارہ میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا یونس نبی اسرائیلی ہے یانہیں) اور خداوندآسمان کے خدا بحر وبر کے خالق سے ڈرتا ہوں۔تب وہ خوف زدہ ہوکراس سے کہنے لگےتو نے یہ کیا کیا۔کیونکہ ان کومعلوم تھا کہ وہ خداوند کےحضور سے بھاگا ہے۔اس لئے کہ اس نے خود ان سے کہا تھا۔تب انہوں نے اس سے پوچھا ہم تجھ سے کیا کریں کہ سمندر ہمارے لئے ساکن ہوجائے کیونکہ سمندرزیادہ طوفانی ہوتا جاتا ہے؟ تب اس نے ان سے کہا مجھ کواٹھا کرسمندر میں پھینک دوتو تمہارے لئے سمندرساکن ہوجائے گا۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑاطوفان تم پرمیرے ہی سبب سے آیا ہے۔توبھی ملاحوں نے ڈانڈ چلانے میں بڑی محنت کی کہ کنارہ پر پہنچیں لیکن نہ پہنچ سکے کیونکہ سمندران کے خلاف اوربھی زیادہ موجزن ہوتا جاتا تھا۔تب انہوں نے خداوند کےحضورگڑگڑا کرکہااے خداوندہم تیری منت کرتے ہیں کہ ہم اس آدمی کی جان کےسبب سے ہلاک نہ ہوں اورتو خونِ ناحق کوہماری گردن پرنہ ڈالے۔ کیونکہ اے خداوندتو نے جو چاہا سو کیا۔اورانہوں نے یوناہ کواٹھا کرسمندر میں پھینک دیا اور سمندر کا تلاطم موقوف ہوگیا تب وہ خداوند سے بہت ڈر گئے اورانہوں نے اس کے حضور قربانی گذرانی اورنذریں مانیں لیکن خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقررکررکھی تھی کہ یوناہ کونگل جائے اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔تب یوناہ نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خداسے یہ دعا کی۔میں نے اپنی مصیبت میں خداوند سے دعا کی اوراس نے میری سنی۔ میں نے پاتال کی تہ سے دہائی دی تو نے میری فریادسنی۔تو نے مجھے گہرے سمندر کی تہ میں پھینک دیااورسیلاب نے مجھےگھیرلیا۔تیری سب موجیں اورلہریں مجھ پر سے گذرگئیں اور میں سمجھا کہ تیرےحضور سے دور ہوگیا ہوں۔لیکن میں پھرتیری مقدس ہیکل کو دیکھونگا سیلاب نے میری جان کا محاصرہ کیا۔سمندر میری چاروں طرف تھا۔بحری نبات میرے سر پر لپٹ گئی۔میں پہاڑوں کی تہ تک غرق ہوگیا۔زمیں کےاڑبنگے ہمیشہ کے لئے مجھ پر بند ہوگئےتو

بھی اے خداوند میرے خدا تو نے میری جان پاتال سے بچائی۔ جب میرا دل بیتاب ہوا تو میں نے خداوند کو یاد کیا اور میری دعا تیری مقدس ہیکل میں تیرے حضور پہنچی۔ جو لوگ جھوٹے معبودوں کو مانتے ہیں وہ شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں حمد کرتا ہوا تیرے حضور قربانی گذرانوں گا۔ میں اپنی نذریں ادا کروں گا۔ نجات خداوند کی طرف سے ہے اور خداوند نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے حکم دیتا ہوں۔ تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اٹھ کر نینوہ کو گیا اور نینوہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کی مسافت تین دن کی راہ تھی اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن کی راہ چلا۔ اس نے منادی کی اور کہا چالیس روز کے بعد نینوہ برباد کیا جائے گا۔ تب نینوہ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ کر بیٹھ گیا اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا۔ اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلّہ یا رمّہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیئے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے ان کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اسے نازل نہ کیا۔ لیکن یوناہ اس سے نہایت ناخوش اور ناراض ہوا اور اس نے خداوند سے یہ دعا کی کہ اے خدا جب میں اپنے وطن ہی میں تھا اور ترسین کو بھاگنے والا تھا تو کیا میں نے یہی نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تو رحیم و کریم خدا ہے جو قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے

باز رہتا ہے۔اب اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کہ میری جان لے لے کیونکہ میرے اس جینے سے مرجانا بہتر ہے تب خداوند نے فرمایا کیا تو ایسا ناراض ہے اور یوناہ شہر سے باہر مشرق کی طرف جا بیٹھا اور وہاں اپنے لئے ایک چھپر بنا کر اس کے سایہ میں بیٹھ رہا کہ دیکھے شہر کا کیا حال ہوتا ہے۔تب خداوند خدا نے کدو کی بیل اگائی اور اسے یوناہ کے اوپر پھیلا دیا اور اس کے سر پر سایہ ہوا اور وہ تکلیف سے بچے۔(بائبل کہتی ہے اس نے پہلے چھپر بنایا اور پھر خدا نے کدو کی بیل اگائی حالانکہ چھپر کے بعد بیل کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔چھپر زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔مگر قرآن کریم میں چھپر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا خالی بیل کا ذکر کیا گیا ہے جو ثبوت ہے کہ قرآنی بیان ہی صحیح ہے اور عقل کے مطابق ہے)اور یوناہ اس بیل کے سبب سے نہایت خوش ہوا۔لیکن دوسرے دن صبح کے وقت خدا نے ایک کیڑا بھیجا جس نے اس بیل کو کاٹ ڈالا اور وہ سوکھ گئی اور جب آفتاب بلند ہوا تو خدا نے مشرق سے لو چلائی اور آفتاب کی گرمی نے یوناہ کے سر میں اثر کیا اور وہ بیتاب ہوگیا اور موت کا آرزومند ہو کر کہنے لگا کہ میرے اس جینے سے مرجانا بہتر ہے اور خدا نے یوناہ سے فرمایا کہ تو اس بیل کے سبب سے ایسا ناراض ہے۔اس نے کہا میں یہاں تک ناراض ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس بیل کا اتنا خیال ہے جس کے لئے تو نے نہ کچھ محنت کی اور نہ اسے اگایا جو ایک ہی رات میں اگی اور ایک ہی رات میں سوکھ گئی۔اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ کا خیال کروں۔جس میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ایسے ہیں جو اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ میں امتیاز نہیں کر سکتے اور بے شمار مویشی ہیں۔(یوناہ باب ۱تا۴)

یہ ہے وہ یوناہ نبی کا واقعہ جس کی طرف حضرت مسیحؑ اشارہ کرتے ہیں۔اس واقعہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوناہ نبی کو جب یہ الہام ہوا کہ جا اور اپنی قوم کو تبلیغ کر۔تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی قوم کو تبلیغ کرتے اس خیال سے کہ نبی جب تبلیغ کرتے ہیں تو انہیں کچھ

انذاری پیشگوئیاں بھی ملتی ہیں ۔لیکن خدا تعالیٰ رحم کر کے اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے، انہوں نے ایک دوسرے ملک کو بھاگ کر جانا چاہا۔تا کہ وہ اس ذلت سے بچ سکیں جو انہیں اپنی قوم سے پہنچ سکتی تھی ۔لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ نینوہ کے لوگوں کی طرف ہی جائیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں ۔چنانچہ اس نے تدبیر کر کے انہیں سمندر میں پھینکوا دیا اور پھر ایک بڑی مچھلی کو انہیں نگل جانے کا حکم دیا جس نے انہیں زندہ نگل لیا۔ چنانچہ بائبل کے بیان کے مطابق وہ مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے اور دعائیں زندہ شخص ہی کیا کرتا ہے نہ کہ مردہ۔پس مچھلی کے پیٹ میں وہ زندہ گئے اور مچھلی کے پیٹ میں جب تک رہے زندہ رہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق مچھلی نے آپ کو اگل دیا۔سمندر میں نہیں بلکہ خشکی پر۔اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نینوہ کے لوگوں کی تبلیغ کے لئے بھجوایا گیا۔ چنانچہ وہ گئے اور اپنی تبلیغ میں کامیاب ہوئے ۔اس معجزہ سے ظاہر ہے کہ

(۱) یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا۔

(۲) وہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا۔

(۳) وہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا۔

(۴) اس کا اصل تبلیغ کا زمانہ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوا۔

پہلے تو انہوں نے لوگوں کو بتایا ہی نہیں کہ مجھے تمہاری اصلاح کے لئے بھجوایا گیا ہے۔ممکن ہے چند لوگوں سے انہوں نے ذکر کیا ہو۔لیکن عام لوگوں کو ان کے مشن کی کوئی خبر نہ تھی ۔وہ وہاں سے بھاگے اور انہوں نے چاہا کہ ایک دوسرے ملک کو نکل جائیں ،لیکن مچھلی کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اپنے ملک میں بھجوا کر کہا کہ اب تبلیغ کرو۔ چنانچہ انہوں نے تبلیغ کی اور لوگ آپ پر ایمان لائے۔

اس نشان کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ واقعہ اسی صورت میں مسیح پر چسپاں ہوسکتا ہے جب

اوّل: مسیح زندہ قبر میں جائے۔

دوم: مسیح زندہ قبر میں رہے۔

سوم: مسیح زندہ قبر میں سے نکلے۔

چہارم: قبر سے نکلنے کے بعد اسے ایک کامیاب تبلیغ کا زمانہ میسر آئے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو یوناہ نبی کے واقعہ سے نکلتی ہیں۔ اگر مسیحی کہانی صلیبی موت کی ٹھیک ہے تو پھر یہ چاروں باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں (۱) اگر مسیح صلیب پر مرگیا اور زندہ قبر میں نہیں گیا اور (۲) اگر مسیح قبر میں تین دن رات مرا رہا بلکہ دوزخ میں رہا تو یوناہ نبی سے اس کی کوئی مشابہت ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یوناہ نبی تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا۔ اور اس کی خدا تعالیٰ سے صلح رہی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا رہا۔ لیکن مسیح اوّل تو مرکر قبر میں گیا اور پھر دوزخ میں رہا۔ گویا وہ خدا تعالیٰ سے دور ہوگیا۔ (۳) اسی طرح اگر مسیح قبر میں سے دوبارہ زندہ ہوکر نکلے ہیں تو اس صورت میں بھی وہ یوناہ نبی کے مثیل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ سے دوبارہ زندہ ہوکر نہیں نکلے ۔ وہ پہلے بھی زندہ تھے، مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رہے اور زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔ (۴) اگر قبر میں سے جی اٹھنے کے بعد مسیحؑ کا مشن ختم ہوگیا جیسے مسیحیت کہتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر پہلے تین دن دوزخ میں رہا اور جب دوبارہ جی کر اٹھا تو آسمان پر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھنے کے لئے چلا گیا۔ تو اس کی یوناہ نبی سے کوئی بھی مشابہت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ یوناہ نبی کا تو یہ معجزہ تھا کہ اسے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک کامیاب تبلیغ کا موقعہ عطا فرمایا۔ اور درحقیقت اصل معجزہ یہی تھا کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ دیکھو

یوناہ نے میری بات کو رد کیا اور وہ میرا پیغامبر نہ بنا وہ ڈرا کہ میں ذلیل ہونگا اور لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ بھاگا لیکن ہم نے اسے مچھلی کے پیٹ میں ڈالا اور پھر مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا اور آخر ہم نے مچھلی کو حکم دیا تو اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا اس کے بعد ہم نے پھر اسے نینوہ میں ہی بھجوایا اور اس نے تبلیغ کی اور وہ اپنی تبلیغ میں کامیاب رہا۔اس طرح خدا تعالیٰ نے اس بات کا اظہار کیا کہ جس شخص کو خدا اپنا پیغمبر بناتا ہے وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا بھی کمزور خیال کرے اور خواہ دنیا کے لوگ اسے کتنا بھی حقیر سمجھیں اللہ تعالیٰ یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ اسی کے ذریعہ اپنے پیغام کو کامیاب کرے اور لوگوں میں اسے مقبول بناوے۔ یہ ہے یوناہ کا اصل نشان جو نینوہ والوں کو دکھایا گیا لیکن مسیح کا واقعہ جس رنگ میں عیسائی پیش کرتے ہیں اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یوناہ سے کوئی بھی مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یوناہ نبی کا اصل معجزہ یہ تھا کہ اسے تبلیغ کا موقعہ دیا گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ وہی جو اپنی کمزوری کی وجہ سے ڈر کر بھاگ گیا تھا ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا۔اور لوگوں نے اس کو قبول کر کے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی۔ ورنہ یوناہ نبی جب مچھلی کے پیٹ میں گئے تھے نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہے تب بھی نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلے تب بھی نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ان کے اور نینوہ والوں کے درمیان اس وقت پانچ سات سو بلکہ ہزار میل کا فاصلہ تھا انہوں نے کب دیکھا کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا یا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا ہے یا مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلا ہے۔ پس ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو نینوہ والوں نے دیکھی ہو۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا اور جب مچھلی نے اسے اگل دیا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔لیکن جب یوناہ

نینوہ والوں کے پاس دوبارہ گیا اورانہوں نے دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جوڈر کر بھاگ گیا تھا مگر پھر خدا تعالیٰ اسے پکڑ کر واپس لایا ہے اور جس جگہ کے متعلق یہ سمجھتا تھا کہ وہاں مجھے کامیابی نہیں ہوگی وہیں اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی عطا فرمائی ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اوراس کی طاقتوں کاایک بہت بڑانشان بن گیا جوانہوں نے دیکھااور مسیح نے اپنے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ

''جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔'' (لوقا باب ۱۱ آیت ۳۰)

اب سوال یہ ہے کہ نینوہ والوں نے کیا دیکھا تھا۔نینوہ والوں نے یوناہ کو مچھلی کے پیٹ میں جاتے نہیں دیکھا۔مچھلی کے پیٹ میں رہتے نہیں دیکھا،مچھلی کے پیٹ سے نکلتے نہیں دیکھا۔نینوہ والوں نے یہی دیکھا کہ ایک شخص پر الہام نازل ہوا کہ جا اور نینوہ والوں کو ہماری طرف بلا۔مگر اسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغام ان کو پہنچائے اوراس نے بھاگ کر کسی اور ملک کو جانا چاہا۔مگر کئی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد خدا تعالیٰ اسے پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور نینوہ والے اس کا پیغام ماننے پر مجبور ہوگئے ۔پس اگر کوئی نشان ایسا ہے جو نینوہ والوں نے دیکھا تو وہ یہی نشان ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا ہے یہ بھی ایک نشان ہے۔مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا یہ بھی ایک نشان ہے اور مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلنا یہ بھی ایک نشان ہے۔مگر یہ نشانات ایسے ہیں جو نینوہ والوں نے نہیں دیکھے۔انہوں نے جو نشان دیکھا وہ یہی ہے کہ یوناہ نبی کے دل میں وسوسہ پیدا ہوااور وہ وہاں سے چلا گیا۔اس نے نہ چاہا کہ نبوت کا پیغام لوگوں تک پہنچائے ۔لیکن خدا اسے سینکڑوں میل سے مجبور کر کے اور کئی قسم کی تکلیفوں میں سے گذار کر پھر اسے اپنی قوم کے پاس لایا اور خدا تعالیٰ نے وہ مشن پورا کر کے دکھا دیا جس کے لئے اس نے یوناہ کو کھڑا کیا تھا۔ لوگوں نے ان کا انکار بھی کیا۔مقابلہ بھی کیا مگر آخر قوم کو جھکنا پڑا۔ یہ نشان تھا جو نینوہ والوں

نے دیکھا، پس مسیح کے لئے بھی یہ نشان اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب مسیح قبر میں زندہ جائے، قبر میں زندہ رہے اور قبر میں سے زندہ نکلے۔ مگر اتنا حصہ وہ ہوگا جس کو دشمن نے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد نشان کا یہ حصہ آئے گا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں کو تبلیغ کر کے جو اس وقت نینوہ کے قریب اور ایران اور افغانستان اور کشمیر میں رہتی تھیں اپنے مذہب میں داخل کرے اور اس طرح اس مقصد میں کامیاب ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو یوناہ نبی سے مسیح کی مماثلت ثابت ہو جاتی ہے اور وہ معجزہ جس کے دکھانے کا انہوں نے وعدہ کیا تھا وہ دنیا پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یوناہ نبی والا نشان پورا نہیں ہوسکتا۔ بہر حال جس طرح یوناہ نبی نے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اپنی قوم کو تبلیغ کی اور وہ اس تبلیغ میں کامیاب ہوئے اسی طرح مسیح کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ قبر میں سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو تبلیغ کرتا اور انہیں ہدایت پر لاتا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو یوناہ نبی کا نشان مکمل نہیں ہوسکتا اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے وہی نشان دکھایا ہے جو یوناہ نبی نے اپنی قوم کو دکھایا تھا۔ نینوہ والوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو نا قابل سمجھتے ہوئے یہاں سے بھاگ گیا تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے گریز کیا تھا وہ پھر ہم میں واپس آیا اور ہم اس پر ایمان لانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن مسیحؑ واقعۂ صلیب کے بعد اگر غائب ہو گیا تھا تو یوناہ سے اس کی مشابہت کس طرح ہوئی اور نینوہ والوں کی طرح کونسا نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا۔ گویا وہ نشان جو یوناہ نبی کی طرح مسیح کے لئے دکھانا ضروری تھا اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بھی کام لے لیتا ہے جو اپنے آپ کو کام کے نا قابل سمجھتے ہیں وہ تو مسیح نے نہ دکھایا اور وہ حصہ جو یوناہ نبی نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھا دیا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے

پیٹ میں سے زندہ نکلا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جب یوناہ کو پھر نینوہ میں لایا تو انہوں نے لوگوں کو کام کر کے دکھایا کہ دیکھو خدا تعالیٰ سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا۔ میں بھاگا تھا مگر پھر مجھے پکڑ کر خدا تمہاری طرف واپس لایا۔ یہ نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا اور ہر شخص جو معمولی عقل و سمجھ سے کام لے کر بھی اس نشان پر غور کرے گا وہ بے اختیار یہ کہہ اٹھے گا کہ سبحان اللہ یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ یوناہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغامبر بنے اور وہ ڈر کر کسی اور ملک کی طرف بھاگا مگر خدا اسے پکڑ کر پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور جب اس نے پیغام پہنچایا تو وہی نینوہ والے جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے یوناہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ وہ اس نشان پر جتنا بھی غور کرے گا اسے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان لانا پڑے گا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ اللہ تعالیٰ کتنی بڑی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رتبہ بخشتا ہے، لیکن اگر یوناہ لوگوں سے یہ کہتا کہ دیکھو میں مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تھا یا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا تھا تو لوگ کہتے یہ بالکل جھوٹ اور فریب ہے ہم اسے نہیں مان سکتے۔ پس مسیح کی یوناہ نبی سے مماثلت اگر پوری ہو سکتی تھی تو اسی طرح کہ وہ یوناہ نبی کی طرح زندہ ہی قبر میں جاتا، زندہ ہی قبر میں رہتا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلتا اور پھر واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کے ایک حصہ میں کامیاب تبلیغ کرتا، لیکن انجیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو نشان یوناہ نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ تو مسیح نے لوگوں کو دکھایا اور جو نشان یوناہ نے لوگوں کو دکھایا وہ مسیح نے نہیں دکھایا۔ مچھلی کے پیٹ میں زندہ جانے، اس کے پیٹ میں زندہ رہنے اور اس کے پیٹ میں سے زندہ نکلنے کا نشان یوناہ نے نینوہ والوں کو نہیں دکھایا۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ قبر میں جانے، قبر میں رہنے اور قبر میں سے نکلنے کا نشان مسیح نے لوگوں کو دکھایا پھر بائبل بتاتی ہے کہ یوناہ نے نینوہ والوں کو یہ نشان دکھایا

کہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اس نے تبلیغ کی اور نینوہ والے اسے ماننے پر مجبور ہوگئے ، لیکن انجیل کہتی ہے کہ مسیح قبر میں سے نکلنے کے بعد غائب ہوگیا اور اس نے کوئی تبلیغ نہیں کی ۔ گویا جو نشان یوناہ نے دکھایا تھا اور جو اصل نشان تھا وہ تو مسیح نے نہیں دکھایا اور جو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھایا ۔ پھر بائبل تو بتاتی ہے کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا ، زندہ رہا اور زندہ نکلا ، لیکن مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح قبر میں مر کر گیا ، قبر میں تین دن مردہ پڑا رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہوکر باہر نکل آیا ۔ اگر مسیحیوں کی یہ بات درست ہے تو یوناہ نبی کا نشان مسیح نے نہیں دکھایا اور اگر اس نے یوناہ نبی کا نشان دکھایا تھا اور وہ صلیب پر نہیں مرا ۔ نہ مردہ ہونے کی حالت میں قبر میں رہا تو کفارہ کا مسئلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے کیونکہ کفارہ تب ثابت ہوتا ہے جب یہ مانا جائے کہ مسیح نے صلیب پر لٹک کر لوگوں کے گناہ اٹھا لئے ، اگر وہ زندہ ہی رہا تھا تو ثابت ہوا کہ اس نے کوئی قربانی نہیں دی تھی اور جب قربانی نہیں دی تھی تو کفارہ بھی باطل ہوا ۔

غرض صلیب کا واقعہ جسے مسیحی پیش کرتے ہیں سرتا پا اس نشان کے خلاف ٹھہرتا ہے جو یوناہ نے دکھایا تھا ۔ اور جس کے دکھانے کا مسیح نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا ۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نتیجہ جو ہم نے یوناہ نبی کی پیشگوئی سے نکالا ہے آیا اس کا ذکر مسیح کی کسی پیشگوئی میں بھی ہے ؟ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم انجیل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہی بات حضرت مسیحؑ نے بھی بیان کی ہے ۔ بلکہ مسیح سے پہلے جو انبیاء گذرے اور جنہوں نے حضرت مسیح کے آنے کی پیشگوئی کی تھی انہوں نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ چنانچہ یسعیاہ میں لکھا ہے :۔

’’خداوند یہوواہ جو بنی اسرائیل کے تتر بتر کیے ہوؤں کا جمع کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے کہ میں ان کے سوا جو اسی کے ہو کے جمع ہوئے ہیں اوروں کو بھی اس پاس جمع کروں گا ۔‘‘ (یسعیاہ باب ۵۶ آیت ۸)

یہاں یسعیاہ نبی یہ پیشگوئی فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ خدا تعالیٰ اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو پھر اکٹھا کرے گا۔اور ایک نبی بھیجے گا جس کے ارد گرد وہ جمع ہو جائیں گے۔یسعیاہ نبی جو اس جگہ یہ خبر دیتے ہیں یہ مسیح کے بارے میں ہے کیونکہ مسیح کے سوا اور کوئی شخص نہیں جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں۔یہ جو گمشدہ بھیڑیں ہیں ان سے مراد بنی اسرائیل کے وہ دس قبیلے ہیں جن کو بنو کدنضر کے زمانہ میں عراقی حکومت نے حملہ کر کے تباہ کر دیا تھا۔اس حملہ کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس وقت یہودیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کی دشمنی میں مشغول رہتے تھے چنانچہ اس وقت یہود کی دو حکومتیں بنی ہوئی تھیں۔ایک اسرائیلی کہلاتے تھے اور دوسرے یہودی کہلاتے تھے۔ایک یوروشلم سے تعلق رکھتے تھے اور دوسروں نے اپنا الگ دارالحکومت بنایا ہوا تھا۔جب عراقی حکومت نے یہودی حکومت کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کیا تو یہود کا ایک حصہ دوسروں کی دشمنی کی وجہ سے ان کے ساتھ مل گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت یہود کی آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ملک پر غالب آ گئی۔اور اس نے یہود کے تمام مقدس مقامات تباہ کر دیئے حتیٰ کہ یوروشلم کا معبد جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہوا تھا اس میں سؤر کی قربانی کی گئی اور اسی طرح اور بہت کچھ مظالم کئے گئے۔چونکہ یہود کا حکومت سے دیر سے مقابلہ چلا آتا تھا اس لئے حکومت نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔چنانچہ بارہ یہودی قبائل میں سے دس کو اس نے پکڑ لیا اور مشرق کے علاقہ میں لا کر پھیلا دیا۔صرف دو قبائل فلسطین میں رہ گئے تھے اور یہ دو قبائل وہ تھے جنہوں نے اپنی قوم سے دشمنی کر کے ساتھ دیا تھا۔اس لئے ان سے دشمن نے رعایت برتی۔بہر حال وہ دس قبائل جو مشرق کے علاقہ میں لا کر پھیلا دیئے گئے تھے ان کے متعلق بائبل میں تو اتنا ہی لکھا ہوا ہے کہ ایران کے مشرق کے علاقہ میں یہود کے دس قبائل کو پھیلا دیا گیا۔لیکن ہماری تحقیقات سے

ثابت ہے کہ یہ علاقے افغانستان اور کشمیر کے تھے اور چونکہ ایک لمبا فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا تھا اور بابلیوں کی کوشش بھی یہی تھی کہ یہ لوگ واپس نہ آئیں اس لئے دیر تک ان کا حال چھپا رہا۔مگر تمام یہود انہوں نے مشرق میں نہیں بھیجے بلکہ کچھ لوگ اپنی خدمت کے لئے انہوں نے بابل اور اس کے ارد گرد رکھ لئے تھے۔ یہ لوگ جو وہاں رہے تھے فارؔس اور میؔد کے بادشاہوں کی مدد سے پھر واپس آئے اور انہوں نے یوروشلم کی بستیاں دوبارہ بسائیں۔ان یہودیوں کا قرآن کریم میں بھی ذکر آتا ہے۔مگر وہ لوگ جو کشمیر اور افغانستان بھیج دیئے گئے تھے ان کا واپس آنا مشکل تھا اور پھر چونکہ وہ ایک لمبا عرصہ بدھوں کے ساتھ رہے اور ان کی تہذیب سے متاثر ہو گئے اس لئے وہ اپنی روایات اور اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو بھی بھول گئے۔اس وجہ سے ان کے واپس آنے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ان لوگوں کے متعلق یہود کا یہ خیال تھا کہ یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مطابق مسیح ان گمشدہ بھیڑوں کو واپس لا کر اپنی قوم سے ملا دے گا۔اور یسعیاہ نبی کی پیشگوئی جس سے یہود کو یہ امید تھی کہ ان کی گمشدہ بھیڑیں پھر اپنے بھائیوں سے آملیں گی وہی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام بھی اس بارہ میں کئی جگہ پر ذکر فرماتے ہیں۔ایک دفعہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی جماعت کو تبلیغ کے لئے بھجوایا تو اس موقعہ پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔''(متی باب ۱۰ آیت ۶)

یہ نصیحت انہوں نے اس لئے کی تا کہ وہ پیشگوئی پوری ہو جائے جو یسعیاہ نبی کی تھی کہ جو اسرائیلی کھوئے گئے ہیں وہ مسیح کے ذریعہ پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔آپ کہتے ہیں غیر قوموں کی طرف توجہ نہ کرنا بلکہ صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور

انہیں تبلیغ کرنا۔

اسی طرح متی باب ۱۵ آیت ۲۱ تا ۲۸ میں لکھا ہے کہ ایک عورت کی لڑکی بیمار تھی۔معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جنّ آدمی کو بیمار کر دیا کرتے ہیں اور اگر جنّ نکال دیا جائے تو آدمی اچھا ہو جاتا ہے۔اس نے سنا ہوا تھا کہ مسیح جنّ نکالتا ہے۔ایک دفعہ حضرت مسیح کہیں جا رہے تھے کہ اس نے آپ کو دیکھ لیا اور وہ آپ کے پیچھے پیچھے شور مچاتی اور آوازیں دیتی دوڑی کہ اے خدا کے مقدس مجھ پر رحم کر اور میری لڑکی کا جنّ نکال دے۔لیکن حضرت مسیح اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ غیر قوم کی تھی۔مگر وہ برابر شور مچاتی چلی جاتی تھی اور درخواست کرتی تھی کہ اس کی بیٹی کو بدروح سے بچایا جائے۔ جب شاگردوں نے دیکھا کہ اس طرح ایک عورت پیچھے پیچھے شور مچاتی آ رہی ہے تو انہوں نے آپ کو توجہ دلائی کہ حضور یہ عورت میلوں میل سے بھاگی چلی آ رہی ہے اور شور مچا رہی ہے کہ میری بیٹی کی بدروح نکالی جائے۔اس پر حضرت مسیح نے کہا

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا''

اس میں حضرت مسیح نے بتایا کہ میرا اصل مقصد یہ ہے کہ اسرائیل کے گھرانے کی وہ دس قومیں جو کھوئی گئی ہیں انہیں تبلیغ کروں اور انہیں پھر اپنے مذہب پر قائم کروں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبیوں کو الہام سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دوسری قوموں میں رہنے کی وجہ سے وہ اپنے مذہب کو بھول چکی ہیں اور موسوی شریعت پر ان کا عمل نہیں رہا اور خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ دوبارہ ان کو مذہب کی طرف لایا جائے۔''کھوئی ہوئی بھیڑوں'' کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ظاہری طور پر وہ غیر ملک میں چلی گئی تھیں بلکہ روحانی طور پر بھی غیر مذاہب کا اثر انہوں نے قبول کر لیا تھا پس وہ روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے کھوئی ہوئی تھیں۔اسی وجہ سے جس طرح حضرت مسیح نے یہ کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان یہودیوں کو

نہیں دکھایا جائے گا اور یہی میرا سب سے بڑا نشان ہوگا۔انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ میرا سب سے بڑا مشن یہی ہے کہ میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو پھر جمع کروں۔ اسی طرح یوحنا میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول درج ہے کہ

''میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں مجھے ان کا بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔'' (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۶)

یہاں حضرت مسیحؑ یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ یہودی کسی اور ملک میں رہتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ''میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں'' یعنی اس ملک کی نہیں۔ بلکہ وہ کسی اور ملک میں رہتی ہیں اور میرے لئے یہ امر فیصل شدہ اور مقدر ہے کہ میں ان کو لاؤں۔ ان بھیڑوں نے تو میرا انکار کیا ہے لیکن وہ میری آواز سنیں گی اور مجھے مان لیں گی۔ یوں تو نبی کا انکار لوگ کیا ہی کرتے ہیں حضرت مسیح کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو ضد کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں مگر وہ ضد کی وجہ سے انکار نہیں کریں گے۔ بلکہ جلد ہی مجھ پر ایمان لے آئیں گے۔'' پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا'' یہ الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ اس وقت موسوی قوم کا ایک بڑا حصہ موسوی شریعت کو چھوڑ بیٹھا تھا اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کے ذریعہ پھر ان کو موسوی مذہب کی طرف واپس لائے اور اس طرح سب کو ایک قوم بنادے۔

ان حوالجات سے ثابت ہے کہ گذشتہ نبیوں کے ذریعہ سے مسیحی مشن کی نسبت یہ خبر دی گئی تھی کہ

(۱) وہ اسی طرح مشرقی ممالک کے یہود کو پیغام دے گا جس طرح فلسطین کے یہود کو دے گا

(۲) یہ کہ مسیح کے نزدیک جہاں فلسطین کی بھیڑوں نے اس کو کم مانا ہے وہاں دوسری بھیڑیں اس کی آواز کو زیادہ سنیں گی اور اس پر جلد ایمان لائیں گی۔

(۳) مسیحؑ کا ان لوگوں تک جانا اور انہیں پیغام پہنچانا ضروری ہے

یہ تین باتیں ہیں جو ان حوالوں سے نکل آتی ہیں اول یہود کے ملک سے باہر کچھ یہودی قبائل ہیں جن تک مسیح اپنا پیغام پہنچائے گا۔ دوسرے وہ لوگ اس کی بات سنیں گے اور اسے مان لیں گے۔ تیسرے مسیحؑ کا ان لوگوں تک جانا کوئی اختیاری بات نہیں۔ بلکہ ان کا وہاں جانا ایک ضروری امر ہے۔ ان تینوں نتیجوں کو یوناہ نبی کی پیشگوئی سے ملا لو تو ایک ہی بات بن جاتی ہے۔ یوناہ نبی کو بھی ایک غیر ملک کی طرف بھجوایا گیا تھا۔ چنانچہ واقعات پڑھ کر دیکھ لو۔ یوناہ نینوہ کی مملکت میں نہیں رہتے تھے۔ انہیں الہام ہوا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ جو مشرق کی طرف ہے۔ اسی طرح مسیح کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرق کی طرف ایک غیر ملک میں جائیں اور انہیں پیغام پہنچائیں۔ دوسرے یوناہ نبی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے جبری طور پر وہاں بھجوایا ورنہ وہ تو وہاں سے بھاگے تھے اور چاہتے تھے کہ نینوہ نہ جائیں لیکن خدا تعالیٰ نے جبر کر کے یوناہ کو وہاں بھجوا دیا۔ اسی طرح پیشگوئی بتاتی تھی کہ حضرت مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ جبراً اپنے ملک سے نکال کر ایک غیر ملک میں لے جائے گا اور ان کے ذریعہ اپنا پیغام یہود کی گمشدہ بھیڑوں تک پہنچائے گا۔ (۳) جب وہ وہاں جائیں گے تو لوگ ان کو قبول کر لیں گے۔ اور ان کے دعویٰ پر ایمان لائیں گے۔

یوناہ نبی کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ اسی طرح ہوا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں گئے، تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہے، پھر مچھلی نے ان کو خشکی پر اگلا۔ اور جب وہ اچھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ اس طرح یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ میں کتنا بھی بھاگوں بہرحال خدا تعالیٰ کی بات مجھے ماننی پڑے گی۔ چنانچہ وہ واپس آئے اور انہوں نے نینوہ والوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ پہلے تو انہوں نے معمولی سا انکار کیا۔ مگر جونہی عذاب کے آثار ظاہر ہوئے انہوں نے مان لیا۔

غرض ان حوالوں کو جب ہم یوناہ نبی کی پیشگوئی کے حوالہ سے ملا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یوناہ نبی والا معجزہ جو حضرت مسیح نے دکھانا تھا وہ مسیح کے زندہ قبر سے نکلنے پر ہی مشتمل نہیں تھا۔ بلکہ اس میں یہ چوتھی بات بھی بتائی گئی تھی اور یہی اہم بات تھی کہ مسیح کو خدا تعالیٰ یوناہ نبی کی طرح ان اسرائیلی قبائل کی طرف لے جائے گا جو کھوئے گئے تھے اور وہ ان کو خدا کا کلام سنائیگا اور وہ لوگ اس کی باتیں مانیں گے اور یہ ایک ایسا نشان ہوگا جسے اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں دیکھیں گی۔ جیسے نینوہ کے لوگوں نے نشان دیکھا تھا۔ اب دیکھو مسیح کے ساتھ جو حالات گذرے ہیں وہ بھی بالکل اسی طرح تھے۔ مسیحؑ فلسطین میں پیدا ہوا۔ اس کی بولی عبرانی تھی۔ اس کی ماں بھی فلسطین میں موجود تھی اور اس کا جو باپ کہلاتا تھا وہ بھی وہیں موجود تھا۔ اسی طرح باپ کے دوسرے بیٹے بھی موجود تھے۔ پھوپھی زاد بھائی بھی وہیں تھے۔ پھر وہاں سب کے سب ان کی اپنی قوم کے لوگ تھے۔ اپنا رسم ورواج تھا۔ اپنا تمدن اور اپنا طریق تھا اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں اور جن سے انسان کا غیر معمولی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر جہاں ان کو بھیجا جارہا تھا وہ ایک غیر ملک تھا اور اس کے ساتھ مسیحؑ کا کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ افغانستان کی زبان کہاں اور فلسطین کی زبان کہاں اور اسی طرح کشمیر کی زبان کہاں اور مسیح کی زبان کہاں۔ ان دونوں میں کوئی بھی تو نسبت نہیں تھی۔ پھر اسرائیلی قبائل بدھوں اور دوسری اقوام سے مل کر انہی کے تمدن اور انہی کے رسم ورواج کو اختیار کر چکے تھے۔ جن کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فلسطین سے افغانستان اور کشمیر تک کا رستہ بھی بڑا کٹھن اور تکلیف دہ تھا۔ اوّل تو کوئی سہولتیں میسر نہ تھیں اور پھر دواڑھائی ہزار میل طے کر کے جانا اور بھی مشکل تھا۔ پس جس طرح یوناہ نبی کا دل نینوہ والوں کی طرف جانے سے گھبراتا تھا اسی طرح مسیح کا دل بھی افغانستان اور کشمیر جانے سے گھبراتا تھا کیونکہ وہاں جانے سے اپنی زبان کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ اپنی قوم کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ

داروں کو چھوڑنا پڑتا تھا۔آسان طریق یہی تھا کہ مسیح اپنی قوم میں رہتے اور فلسطین میں بیٹھے ہوئے یہود کو تبلیغ کرتے رہتے۔مگر جس طرح یوناہ نبی نے گریز کیا تو خدا تعالیٰ نے اس پر جبر کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ جن کے نتیجہ میں وہ مجبور ہو کر نینوہ والوں کے پاس جائیں اورانہوں نے بھی سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ سے بھاگنے کے کوئی معنے نہیں ، جہاں وہ مجھے بھجوانا چاہتا ہے وہاں مجھے ضرور جانا چاہیئے ۔اسی طرح حضرت مسیح کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کیے کہ ملک میں ان کے خلاف مخالفت کی ایک عام رو چل پڑی۔ یہاں تک کہ ان پر مقدمہ ہوا۔انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑااور آخر عدالت نے انہیں پھانسی کا حکم دے دیا اور پھر صلیب پر انہیں لٹکنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی پیشگوئی کے مطابق اسی طرح بچا لیا جس طرح یوناہ کو بچایا تھا۔جس طرح یوناہ نبی کو جب سمندر میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی مقرر کر دی تھی جس نے انہیں زندہ نگل لیا اور پھر وہ مچھلی کے پیٹ میں تین رات دن زندہ رہے اور پھر زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکل آئے اور یہ دیکھ کر ان کا ایمان تازہ ہو گیا کہ میرے رب میں کتنی بڑی طاقتیں ہیں اور وہ کس طرح اپنے بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔اسی طرح حضرت مسیح بھی جب صلیب پر سے زندہ اترے۔قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی قبر میں سے باہر آئے تو ان کا ایمان بھی تازہ ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ میں بہت بڑی طاقتیں ہیں۔مگر جب قبر میں سے نکلے تو اب حالات کی وجہ سے وہ اس ملک میں جانے پر مجبور ہو گئے جس ملک میں اللہ تعالیٰ انہیں بھجوانا چاہتا تھا ، کیونکہ حکومت کی طرف سے جس کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور پھر وہ بچ رہا ہو، وہ اس ملک میں رہ ہی نہیں سکتا اگر رہے گا تو پکڑا جائے گا اور پھر دوبارہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔غرض خدا تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ یوناہ نبی کی طرح وہ مجبور ہو کر کشمیر اور افغانستان کی طرف چلے گئے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی خدا کی راہ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن نبی نکمی

زندگی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ کام کے لئے پیدا کیا جاتا ہے اور کام ہی کا عاشق ہوتا ہے وہ ایک مشین ہوتا ہے جو ہر وقت چلتی ہے پھر کس طرح ہوسکتا تھا کہ مسیحؑ اپنی باقی عمر ادھر اُدھر چھپ کر گزار دے ۔ پس اس واقعہ نے جہاں اس کے ایمان کو اور بھی مضبوط کر دیا، وہاں اسے جلد سے جلد فلسطین چھوڑ کر یوناہ نبی کی طرح مشرق میں جا کر خدا تعالیٰ کا کلام سنانے پر مجبور کر دیا۔ جب مسیحؑ نے ان کو یہ واقعات سنائے ہوں گے اور بتایا ہوگا کہ ان ان حالات کی وجہ سے میں تمہاری طرف آنے پر مجبور ہوا ہوں تو کس طرح ان کے ایمان بڑھ گئے ہوں گے اور کس طرح ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے ۔ کشمیر کی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کشمیر میں داخل ہوئے تو ان کے زخم ابھی موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں جراح اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے ۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب شہزادہ نبی کشمیر پہنچا تو اس کے ہاتھوں اور پیروں پر زخم تھے جن کا ایک لمبے عرصہ تک وہاں کے جراح علاج کرتے رہے۔ جب حضرت مسیحؑ نے ان کو یہ واقعات سنائے ہوں گے کہ اس طرح جبراً اللہ تعالیٰ مجھے فلسطین سے نکال کر تمہاری طرف لایا۔ اگر میں وہیں رہتا تو وہ دوبارہ مجھے پھانسی دے دیتے ۔ تو وہ اپنی خوش قسمتی پر کتنا ناز کرتے ہوں گے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا تھا کہ انہیں پھر بچا لیتا۔ وہ پھر صلیب پر لٹکاتے تو پھر بچا لیتا مگر اس طرح صلیب پر چڑھنا اور اترنا ہی رہتا تو حضرت مسیحؑ تبلیغ نہیں کرسکتے تھے۔ بہر حال جب یہ باتیں انہوں نے سنی ہوں گی تو ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت کتنی بڑھ گئی ہوگی کہ وہ ایک نبی کو مجبور کر کے ہمارے ملک میں لایا تا کہ ہم اس کے ذریعہ سے ہدایت حاصل کریں ۔ بے شک بعض لوگوں نے مخالفت بھی کی ہوگی اور مخالفت ہونی بھی چاہیئے ، مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیح کے بہت جلد معتقد ہو گئے اور بہت جلد انہوں نے ایک نبی کی حیثیت میں آپ کو ماننا شروع کر دیا۔ غرض ان حالات میں خدا تعالیٰ نے ان کو مجبور کر کے

وہاں بھجوادیا۔اگر ہم یہ تشریح نہ مانیں تو کفارہ تو الگ رہا مسیح ایک سچا اور راستباز انسان بھی نہیں رہتا۔کیونکہ مسیح صاف کہتا ہے کہ میں قبر میں زندہ جاؤں گا،قبر میں زندہ رہوں گا اور قبر میں سے زندہ نکلوں گا اور یہ کہ ان واقعات کے بعد میرا گمشدہ بھیڑوں کی طرف جانا ضروری ہے تا کہ یوناہ نبی سے میری مماثلت ثابت ہو جائے۔یوناہ آخر کس وقت تبلیغ کے لئے نینوہ والوں کی طرف گئے تھے۔اسی وقت جب وہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔اسی طرح مسیح کا اصل کام کا زمانہ وہی تھا جب وہ قبر سے نکلا۔اگر یہ بات واقع نہیں ہوئی اور اگر قبر میں سے زندہ نکلنے کے بعد مسیح نے تبلیغ نہیں کی اور اس نے اپنی گم شدہ بھیڑوں کو جمع نہیں کیا،تو مسیح بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور یسعیاہ وغیرہ وہ انبیاء بھی نعوذ باللہ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں جنہوں نے مسیح کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرے گا۔

پس یہ واقعات اس امر کا قطعی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ مسیح کے لئے صلیب پر مرنا یا کفارہ ہونا مقدر ہی نہیں تھا۔اور اگر کفارہ کو مانا جائے تو مسیح کو سچا ماننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس کی سب سے بڑی پیشگوئی جھوٹی نکلتی ہے اس طرح وہ کلام بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے جو یسعیاہ نبی پر نازل ہوا اور جس کی بعض اور نبیوں نے بھی خبر دی تھی۔پس ثابت ہوا کہ مسیح نے وہ قربانی نہیں کی جو کفارہ ماننے والے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور نہ وہ کفارہ ہوا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو واقعہ ہوا کیا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح زندہ قبر میں جائے گا زندہ قبر میں رہے گا اور زندہ قبر میں سے نکلے گا یا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح قبر میں مردہ گیا۔مردہ ہونے کی حالت میں ہی رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکلا۔میں اس غرض کے لئے چند بڑی بڑی باتیں بیان کرتا ہوں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسیح جس حاکم کے سامنے پیش کیا گیا وہ حاکم مسیح کا خیر خواہ تھا اور

مسیح کے بعض ماننے والوں کا دوست تھا۔ مسیح کے ماننے والے جو ابھی ظاہر میں حواری نہیں بنے تھے لیکن دل سے آپ پر ایمان لا چکے تھے ان میں ایک یوسفؔ آرمیتیا بھی تھا۔ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ یوسف آرمیتیا بوجہ اس کے کہ یہودیوں میں بڑا معزز اور مالدار انسان تھا، پیلاطوس کا دوست تھا۔ جب مسیح پیلاطوس کے سامنے پیش ہوئے تو پیلاطوس نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح وہ مسیح کو چھوڑ دے۔ اس بارہ میں اس نے جو تدابیر کیں ان میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ جس دن وہ پیش ہوئے وہ جمعہ کا دن تھا اور جمعہ کے ساتھ ہی سبت کا دن آتا ہے، جو یہودیوں کا ایک مقدس تہوار ہے۔ مگر اس دن ایک اور خاص تہوار بھی تھا جس میں رومی حکومت یہود کو خوش کرنے کے لئے ایک قیدی چھوڑا کرتی تھی تا کہ یہود یہ سمجھیں کہ حکومت مذہب کا احترام کرتی ہے اور اس کا دل ان کے مذہب سے متاثر ہے۔ اس تقریب کی وجہ سے پیلاطوس نے یہ کوشش کی کہ وہ حضرت مسیح کو یہ کہہ کر کہ ہم نے کوئی نہ کوئی قیدی تو چھوڑنا ہی ہے چلو اسے ہی چھوڑ دیں آپ کو رہا کر دے۔ مگر یہودیوں نے کہا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مان سکتے فلاں ڈاکو کو بیشک چھوڑ دیا جائے مگر مسیح کو نہ چھوڑا جائے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۲۱،۲۲) اس بارہ میں انجیل میں بہت سے اختلافات ہیں جن میں اس وقت پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال مسیح کو انہوں نے چھڑوانے نہیں دیا۔ اتنے میں جب پیلاطوس اپنی ذاتی دلچسپی سے مسیح کو چھوڑنے کی کوشش کر رہا تھا عدالت میں ایک پیغامبر آیا اور اس نے کہا کہ مجھے آپ کی بیوی نے بھجوایا ہے۔ جب پیلاطوس اس کی بات سننے کے لئے اٹھا تو اس نے کہا آپ کی بیوی نے مجھے یہ پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا ہے کہ آج میں ساری رات سوئی نہیں کیونکہ فرشتے مجھے بار بار آ کر کہتے تھے کہ یہ شخص بے گناہ ہے اسے سزا نہ دینا ورنہ مر جاؤ گے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۱۹) پیلاطوس نے جب یہ بات سنی تو اس نے مزید کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح یہودی مسیح کو رہا کر دینا مان لیں۔ مگر انہوں نے نہ مانا بلکہ

انہوں نے دھمکی دی کہ ہم روم میں بادشاہ کولکھیں گے کہ ایک شخص جوحکومت کا باغی تھا اور بادشاہت کا دعویٰ کرتا تھا پیلاطوس نے اسے چھوڑ دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پیلاطوس بھی باغی ہے ۔ یہ سن کر پیلاطوس ڈر گیا اوراس نے پانی منگوایا۔ یہودیوں کوتمثیلی زبان میں گفتگو کرنے کا بہت شوق تھا۔اسی طریق کے مطابق اس نے پانی منگوایا اورسب کے سامنے اپنے ہاتھ دھوکر کہا کہ مجھ پراس گناہ کی کوئی ذمہ داری نہیں میں اس انسان کے خون سے بری ہوں۔ اگر گناہ ہوگا تو وہ تم پراورتمہاری اولادوں پر ہوگا۔اس پرسب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہاں ہاں اس کا خون ہم پراور ہماری اولادوں کی گردن پر ہے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۲۴،۲۵)

تب پیلاطوس نے مسیح کوان کے حوالے کردیا کہ اسے لے جاؤاورصلیب پرلٹکادو۔

جب وہ مسیح کو لے کرصلیب کے مقام پر پہنچے ہیں تو انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت چھٹا گھنٹہ آ گیا تھا۔اور چھٹے گھنٹے کے معنے اس زمانہ کے لحاظ سے تین اور چار بجے کے درمیان کے وقت کے ہے۔اس دن دواور مجرم بھی پیش تھے جن کو پھانسی پرلٹکایا جانا تھا۔اب یہ بات ظاہر ہے کہ ایک مجرم کے لٹکانے اورتین مجرموں کے لٹکانے میں بہت فرق ہوتا ہے ایک آدمی کوتھوڑے سے وقت میں لٹکایا جا سکتا ہے مگر تین آدمیوں کولٹکانے کے لئے لازماً زیادہ وقت لگے گا۔ پھرایک اور بات بھی ہے جس کو عام طور پر نہ مسلمان سمجھتے ہیں اور نہ بوجہ اپنے مذہب سے ناواقف ہونے کے عیسائی سمجھتے ہیں۔اس زمانہ میں صلیب کے لئے ایک لکڑی گاڑی جاتی تھی،جس کی شکل اس قسم کی ہوا کرتی تھی۔
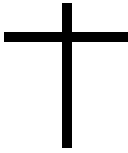
جب کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ ہوجاتا تھا کہ اسے صلیب پرلٹکایا جائےتو وہ اس لکڑی کے ساتھ سیدھا کھڑا کر دیا جاتا اوراس کے بازوؤں کو پھیلا کردوڈنڈوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا اس کے بعد مجرم کے بازوؤں اورٹانگوں کے نرم گوشت میں کیل گاڑ دیئے جاتے اوروہ اسی طرح بھوکا پیاسا صلیب

پر لٹکا لٹکا مر جاتا۔بعض حالات میں علاوہ ان کیلوں کے جو بازوؤں کے گوشت اور پنڈلیوں کے گوشت میں گاڑے جاتے تھے وہ ایک ایک کیل ہتھیلیوں میں بھی گاڑ دیتے تھے،لیکن جن لوگوں کوعلم التشریح کی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ یہاں بھی کیلوں کا گاڑنا ہڈیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ بہرحال صلیب دیتے وقت کیل جسم کی ہڈیوں میں نہیں گاڑے جاتے تھے بلکہ بازوؤں اور پنڈلیوں کے نرم نرم گوشت میں گاڑے جاتے تھے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسم کے گوشت میں کیل گاڑ دینا یہ بھی انسان کو خطرناک تکلیف پہنچاتا ہے۔ بلکہ کیل تو الگ رہے معمولی ٹیکہ سے بھی بعض لوگ چیخیں مارنے لگ جاتے ہیں۔لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس صلیب سے انسان کی موت کئی دنوں کے بعدواقع ہوتی تھی۔اور وہ سسک سسک کر اپنی جان دیتا تھا فوری طور پر موت واقع نہیں ہوتی تھی۔اس میں صرف ہیبت کا پہلو ہے جو دماغی لحاظ سے سخت اذیت پہنچاتا ہے یعنی انسان یہ دیکھتا ہے کہ اب کیل آگئے ہیں اب ہتھوڑا آ گیا ہے اب کیل گاڑنے والا آ گیا ہے۔اب کیل گاڑنے کے لئے اٹھا ہے۔اب کیل جسم پر رکھا گیا ہے۔اب کیل پر ہتھوڑا پڑنے والا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جواس کے دماغ کو خوف زدہ کر دیتی ہیں اور وہ اس کی ہیبت سے شدید متاثر ہوتا ہے ورنہ محض گوشت کٹ جانے سے ایسی تکلیف نہیں ہوتی جسے برداشت نہ کیا جا سکتا ہو۔لڑائیوں میں ہزاروں مرتبہ تلوار لگتی ہے اور گوشت کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے مگر چونکہ وہ تلوار یکدم آ پڑتی ہے اس لئے اس کی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔لیکن کیل کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اب نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔لیکن تلوار لگ کر اگر گوشت کٹ جائے تو بعض دفعہ اس کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جتنی ڈاکٹر کی سوئی سے انسان محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کا پتہ اسی وقت لگتا ہے جب گوشت کٹ چکا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسی حالت میں جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہڈی سلامت ہے تو بجائے گھبرانے کے بے اختیار الحمد للہ کہہ اٹھتا ہے۔لیکن جب ڈاکٹر ٹیکہ

لگانے کے لئے سرنج تیار کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید ڈاکٹر مجھے ذبح کرنے لگا ہے اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیح کے ساتھ جو کچھ گذرا وہ دماغی لحاظ سے ایک نہایت ہی تکلیف دہ واقعہ تھا۔لیکن وہ حقیقی تکلیف جس سے انسان مر جاتا ہے وہ آپ کو نہیں ہوئی۔لیکن چونکہ آپ نازک طبیعت انسان تھے آپ نے اس تکلیف کو بھی شدّت سے محسوس کیا اور بے ہوش ہو گئے۔اس کے مقابلہ میں وہ چور جو آپ کے دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے وہ ایک دوسرے سے مذاق کرتے رہے۔ بلکہ ان میں سے ایک نے مسیح کو طعنہ دے کر کہا کہ اگر تو مسیح ہے تو اپنے آپ کو بھی اور ہم کو بھی بچا۔اس پر دوسرے نے اس کو جھڑک کر کہا تو خدا سے ڈر۔ہم تو اپنے کیے کی سزا پا رہے ہیں اور یہ بے گناہ ہے۔(انجیل لوقا باب۲۳ آیت ۳۹۔۴۰) اب دیکھو وہ صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں مگر مذاق جاری ہے کیونکہ وہ سنگدل لوگ تھے اور ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔اسی قسم کی طبیعت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اندر سختی برداشت کرنے کا مادہ رکھتے ہیں۔کشمیر میں ہی ہمارا ایک احمدی خاندان ہے جو پہلے زمانہ میں مظفر آباد کے راجہ تھے مہاراجہ کشمیر نے حملہ کر کے انہیں شکست دی اور راجہ کو قید کر کے سرینگر لے آیا اور ان کے گذارہ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت کی بات ہے جس کے زمانہ میں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ریاست جموں و کشمیر میں ملازم تھے۔وہ مسلمان راجہ بڑا خوبصورت اور قوی نوجوان تھا اور اس کی شکل مہاراجہ کو بڑی پسند تھی۔ایک دن وہ پولو کھیلتے ہوئے گرا اور اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ انہوں نے علاج کرایا اور ہڈی جڑ گئی۔مگر ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی۔ایک دن دربار لگا ہوا تھا کہ مہاراجہ نے کہا کیوں راجہ صاحب آپ فلاں دن پولو کھیلتے ہوئے گرے تھے اور آپ کو چوٹ آئی تھی۔ بتایئے اب ہڈی کا کیا حال ہے جڑ گئی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا جڑ گئی ہے۔اس نے کہا آئیں مجھے دکھائیں۔انہوں نے دکھائی تو کہنے لگا راجہ صاحب یہ آپ نے کیا کیا، یہ

ہڈی تو ٹیڑھی جڑی ہے اور اس سے آپ کی خوبصورتی پر دھبہ آ گیا ہے آپ اتنے خوبصورت انسان تھے۔ آپ مجھے بتاتے تو میں اپنا ڈاکٹر آپ کے لئے مقرر کر دیتا اور اس ہڈی کو بالکل صحیح جڑوا دیتا۔ وہ اس وقت کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بازو پر دباؤ ڈال کر اتنے زور سے اسے جھٹکا دیا کہ بازو دو ٹکڑے ہو گیا اور کہنے لگے ''مہاراج اب جڑوا دیں'' یہ دیکھ کر مہاراج کی ایسی حالت ہوگئی کہ وہ بے ہوش ہونے لگا اور دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔ تو ایسے ایسے سنگدل لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں ان باتوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ مگر حضرت مسیح ایک نازک مزاج انسان تھے۔ اردگرد کے چور تو مذاق کرتے رہے اور مسیح بے ہوش ہو گئے جب انہیں ہوش آیا تو کراہنا شروع کر دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حواس قائم تھے کیونکہ انجیل بتاتی ہے کہ اوپر سے آپ کی والدہ آ گئیں۔ آپ نے اپنی والدہ کو دیکھا اور آپ پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نامعلوم میری والدہ کو اس وقت کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ سامنے ہی آپ کا ایک شاگرد تھوما نامی کھڑا تھا۔ آپ نے تھوما کی طرف دیکھا اور کہا۔ اے تھوما یہ تیری ماں ہے اور اپنی والدہ سے کہا کہ اے عورت یہ تیرا بیٹا ہے۔ بعض لوگ تھوماس سے یہ غلطی کھاتے ہیں کہ تھوماس کے معنی ہوتے ہیں توأم بھائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح کا باپ تھا لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے۔ تھوماس کے معنے عبرانی میں دودھ شریک بھائی کے ہوتے ہیں۔ پس اس نام سے صرف اتنا نکلتا ہے کہ حضرت مسیح کو جس عورت کا دودھ پلایا گیا تھا اسی عورت نے تھوماس کو بھی دودھ پلایا تھا۔ یا یہ کہ خود حضرت مریم کا دودھ اس نے پیا تھا۔ اور اس طرح وہ حضرت مسیحؑ کا دودھ شریک بھائی ہو گیا تھا بہرحال حضرت مسیح نے اس چھوٹے سے فقرہ میں نہایت لطیف طریق پر ایک طرف تھوما کو توجہ دلائی کہ میں تو اس وقت صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور گو مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے اس کے وعدوں کے سمجھنے میں کوئی غلطی کی ہو۔ اس

لئے اب میں اپنی والدہ کو تیرے سپرد کرتا ہوں اور اپنی والدہ سے کہا کہ تھوما کو اپنا بیٹا سمجھنا۔ ساری انجیل میں اپنی ماں سے محبت کا اظہار اگر حضرت مسیح نے کیا ہے تو صرف اس جگہ، ورنہ انجیل پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں اپنی والدہ سے کچھ خارسی ہے کیونکہ کسی جگہ پر ان کی محبت کا اظہار نہیں۔ بہر حال حضرت مسیح کی یہی کیفیت رہی کبھی انہیں ہوش آ جاتا اور کبھی وہ بے ہوش ہو جاتے اس موقعہ پر پیلاطوس کی طرف سے جو پہریدار مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل میں ان کے مرید تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت مسیح تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تو وہ دوڑے گئے اور انہوں نے اسفنج کا ایک ٹکڑا لے کر اسے شراب اور مُر سے بھگویا اور حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا۔ انجیل میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ اسفنج کو سرکہ میں ڈبو کر انہوں نے حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۲۶) مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ کو شراب اور مُر کا مرکب دیا گیا (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۴ زیر لفظ صلیب) عیسائی لوگ بعض دفعہ اس بات پر بڑا زور دیا کرتے ہیں کہ یہود نے آپ پر اتنا ظلم کیا کہ جب آپ شدت تکلیف سے کراہ رہے تھے تو انہوں نے شراب اور مُر کے مرکب میں اسفنج بھگویا اور چوسنے کے لئے آپ کو دیا۔ حالانکہ رومی کتب کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص کے ساتھ وہ رعایت کرنا چاہتے تھے اور جس کو وہ تکلیف سے بچانا چاہتے تھے اس کو وہ شراب اور مُر کا مرکب دیا کرتے تھے معلوم نہیں طبی طور پر یہ چیز فائدہ بخش بھی ہے یا نہیں لیکن اس زمانہ میں لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جس کو شراب اور مر دی جائے اس کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ پس یہ واقعہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ لوگ جو آپ کے پہرہ کے لئے مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل میں آپ کے مرید تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی تکلیف کو کم کرنے میں وہ جس قدر بھی حصہ لے سکتے ہوں لیں۔ پھر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انہیں جمعہ کے دن پچھلے پہر صلیب پر لٹکایا گیا تھا اور مغرب سے سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا۔ آجکل تو رات کے بارہ بجے کے بعد سے اگلا

دن شمار کیا جاتا ہے لیکن اسلامی طریق یہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اگلا دن شروع ہو گیا ہے اور یہی طریق بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا۔اس لحاظ سے سورج کے غروب ہوتے ہی سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا اور یہودیوں میں بات مشہور تھی کہ اگر کوئی سبت کے دن صلیب پر لٹکا رہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ دو تین گھنٹہ کے بعد ہی پیلاطوس نے انہیں توجہ دلائی کہ اگر یہ صلیب پر لٹکا رہا اور سبت کا دن شروع ہو گیا تو تم پر عذاب آ جائے گا۔ادھر اللہ تعالیٰ نے یکدم ایک زور دار آندھی چلا دی جس سے چاروں طرف تاریکی چھا گئی (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳) اس کو دیکھ کر یہودی اور بھی ڈرے کہ ایسا نہ ہو یہ صلیب پر رہے اور سبت شروع ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیلاطوس سے درخواست کی کہ اب ان کو اتار لیا جائے (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱) ایسا نہ ہو کہ ہم پر عذاب نازل ہو جائے۔اب فرض کرو انہیں سورج غروب ہونے سے آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ پہلے اتار لیا گیا تھا۔تب بھی ان کی صلیب کا وقت کچھ نہ کچھ تو ضرور کم ہو جائے گا۔اگر سات بجے سورج غروب ہوا کرتا تھا اور ساڑھے تین بجے انہیں صلیب پر لٹکایا گیا تھا تو یہ کل وقت ساڑھے تین گھنٹے بنتا ہے۔لیکن چونکہ شدید آندھی کی وجہ سے سخت تاریکی چھا گئی تھی اور سبت شروع ہو جانے کے خوف سے انہیں جلدی اتار لیا گیا تھا اس لئے اگر آدھ یا پون گھنٹہ بھی یہ وقت فرض کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اڑھائی سے تین گھنٹہ تک حضرت مسیح کو صلیب پر رہنا پڑا۔حالانکہ اس صلیب پر سات سات دن تک بھی بعض لوگ زندہ رہتے تھے اور وہ صرف بھوک اور پیاس کی وجہ سے یا زخموں کا زہر جسم میں پھیل جانے کی وجہ سے ہلاک ہوتے تھے۔ پھر یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو لوگ صلیب پر سے زندہ اتر آتے تھے ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں۔مگر پہریدار چونکہ حضرت مسیح کے مرید تھے انہوں نے چوروں کی تو ہڈیاں توڑیں مگر مسیح کی ہڈیاں نہیں توڑیں دراصل صلیب دینے کے اصل معنے بھی ہڈیاں توڑ کر گودا نکال دینے کے ہیں

اور یہ نام اسی لئے رکھا گیا تھا کہ اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ بعد میں ہڈیاں توڑ کر ان کا گودا نکالا جاتا تھا۔لیکن حضرت مسیحؑ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت۳۳) پھر حضرت مسیح کے صلیب پر سے زندہ اتر آنے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ انجیل میں لکھا ہے۔ جب حضرت مسیح کو اتارا گیا تو ایک سپاہی دوڑتا ہوا گیا اور اس نے آپ کی پسلی میں آہستہ سے نیزہ مار کر دیکھا تو اس میں سے خون اور پانی بہ نکلا (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت۳۴) جسم میں سے خون اور پانی نکلنا تو کوئی محاورہ نہیں۔اس کے معنے یہی ہیں کہ سیال خون نکل آیا۔ورنہ انجیل کا بیان ہی اگر درست ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پانی الگ چیز ہے اور خون الگ۔اور خون کو سیال بنانے والی سرم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے حالانکہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں۔پس اس کے معنے پانی اور خون کے نہیں بلکہ بہتے ہوئے خون کے ہیں۔مگر یہودیوں میں انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ مر گیا ہے اور اسی لئے ہم نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں۔معلوم ہوتا ہے یہودی بھی دل میں گھبرائے ہوئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے ایک بے گناہ کو سزا دلوائی ہے۔پس چونکہ ان کے دل میں چور تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہم ایک نیک اور خدا رسیدہ انسان کو سزا دلوا رہے ہیں۔اس لئے جب انہوں نے ایک شدید آندھی دیکھی تو ڈر گئے۔کہ یہ تو خدا تعالیٰ کا عذاب معلوم ہوتا ہے اور انہوں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی بلکہ کہا کہ اچھا اگر وہ مر گیا ہے تو اسے دفن کر دو۔

ان تمام واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیح کے صلیب پر مرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔عام طور پر ساتویں دن تک بھی لوگ زندہ رہا کرتے تھے اور ہڈیاں توڑ کر انہیں مارنا پڑتا تھا کجا یہ اڑھائی یا تین گھنٹہ تک صلیب پر رہنے کے نتیجہ میں وہ فوت ہو جاتے۔ان کا صلیب پر لٹکنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹے ہو سکتا ہے مگر جب اس صلیب پر سات سات دن تک بھی لوگ زندہ رہتے تھے تو ساڑھے تین گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم عرصہ

میں آپ کس طرح فوت ہو سکتے تھے اور پھر وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ آپ کے ماننے والے آپ کے پہرہ دار تھے اور انہوں نے آپ کی تکلیف کو کم کرنے اور آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہرحال جب حضرت مسیح کو صلیب پر سے اتارا گیا تو یوسف آرمیتیاہ پیلاطوس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ لاش میرے حوالے کی جائے۔ چنانچہ پیلاطوس نے حکم دے دیا کہ لاش یوسف آرمیتیاہ کو دے دی جائے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۵۸) اس کے بعد یوسف آرمیتیاہ نے ان کو ایک قبر میں جا کر رکھ دیا۔ مگر وہ قبر ہماری قبروں جیسی نہیں تھی۔ اس قبر میں تو کسی کو رکھا جائے تو اس کا سانس بند ہو جائے کیونکہ یہ اور طرح بنائی جاتی ہے۔ وہ قبر ایک کھلی کوٹھڑی تھی جو چٹان میں کھدی ہوئی تھی (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۰) یوسف آرمیتیاہ نے اس قبر میں حضرت مسیح کو جا کر رکھ دیا اور سامنے دروازہ پر ایک پتھر لڑھکا دیا (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۱) تاکہ لوگوں کو شبہ بھی نہ ہو اور ہوا کی آمد و رفت بھی جاری رہے۔ یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ امر قطعی طور پر ناممکن تھا کہ مسیح صلیب پر مر سکتا۔ یوں تو بعض دفعہ انسان بیٹھے ہوئے زمین سے اٹھنے لگتا ہے تو اس کا دم نکل جاتا ہے۔ چلتے چلتے کھڑا ہوتا ہے تو دم نکل جاتا ہے مگر یہ اور چیز ہے۔ ہم جس امر پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ عام طور پر ان حالات میں جو حضرت مسیح کو پیش آئے لوگ مرا نہیں کرتے بلکہ زندہ رہتے ہیں اور حضرت مسیح کی موت بھی ان حالات میں قطعی طور پر ناممکن تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک ان کے ساتھ ایسے لوگ رہے جو ان کے مرید تھے یا ان کے دوست اور خیر خواہ تھے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش آپ کو بچانے کے لئے کی۔ پھر ان کی خیر خواہی کا اس امر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت مسیح کو صلیب پر سے اتار لیا گیا اور ایک قبر میں رکھ دیا گیا تو یہودیوں نے درخواست کی کہ جس کوٹھڑی میں مسیح کو رکھا گیا ہے اس پر تین دن تک پہرہ لگا دیا جائے کیونکہ مسیح کہا کرتا تھا کہ میں یوناہ کی طرح تین دن رات کے بعد زندہ ہو جاؤں گا۔ مگر پیلاطوس نے انہیں سرکاری

پہرہ دار دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ”تمہارے پاس پہرے والے ہیں جاؤ جہاں تک تم سے ہو سکے اس کی حفاظت کرو“ (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۵)

پیلاطوس کے اس انکار سے یہی غرض تھی کہ اگر سرکاری پہرہ دار مقرر کئے گئے تو حضرت مسیح باہر نہیں نکل سکیں گے اور اگر وہ پہرہ داروں کا مقابلہ کریں گے تو ان کا مقابلہ حکومت کا مقابلہ سمجھا جائے گا لیکن اگر عام لوگ پہرہ پر ہوئے تو ان کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کیا جاسکے گا۔ پس پیلاطوس نے انکار کر دیا اور کہا میں پولیس دینے کے لئے تیار نہیں۔ پھر اس کے بعد جو واقعات ہوئے وہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے۔

اگر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق مسیح مر کر زندہ ہو چکے تھے تو وہ خدا کے بیٹے بن چکے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں لوگوں کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد وہ چھپ چھپ کر پھرا کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہا کرتے تھے کسی کو بتانا نہیں کہ میں زندہ ہوں بلکہ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے حواریوں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ ممکن ہے یوسف آرمیتیاہ کے مکان میں ہی رہتے ہوں۔ کیونکہ لکھا ہے کہ مسیح یکدم ظاہر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی کہیں اِدھر اُدھر غائب ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب وہ اپنے حواریوں کے پاس آئے تو انہیں دیکھنے کے باوجود یقین نہ آیا کہ یہ سچ مچ مسیح کھڑا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اور کچھ شہد دیا اور اس نے ان کے سامنے کھایا تب انہیں یقین آیا کہ وہ واقعہ میں مسیح کو دیکھ رہے ہیں (انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳)

اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی روح ایسا نہیں کیا کرتی۔ اس قسم کے کام جسم ہی کیا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ قانونِ حکومت کے مطابق وہ پھانسی کی سزا کے مستحق ہو چکے تھے اور اگر پکڑے

جاتے تو دوبارہ پھانسی پر لٹکا دئے جاتے اس لئے ضروری تھا کہ وہ چھپ کر رہتے اور حواریوں کو بھی نہ بتاتے کہ وہ کہاں رہائش رکھتے ہیں۔

بہرحال انجیل کے بیانات سے امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ صلیب پر زندہ رہے۔قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی اس قبر میں سے نکلے اور انہوں نے حواریوں کو بتایا کہ میں زندہ ہوں۔لطیفہ یہ ہے انجیل بتاتی ہے جب تھوما کو یہ خبر پہنچی کہ مسیح زندہ ہے تو اس نے کہا جب تک میں اس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھوں گا اور جب تک ان کیلوں کے نشان میں اپنی انگلی نہ ڈالوں گا میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہوگیا ہے اس پر حضرت مسیحؑ نے تھوما کو بلایا اور کہا میرے ہاتھوں کو دیکھ اور اپنا ہاتھ میری پسلی میں ڈال اور دیکھ کہ میں مسیح ہی ہوں کوئی روح نہیں۔(انجیل یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۴ تا ۲۹)

یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے جو پیشگوئی کی تھی کہ یوناہ نبی کا نشان اس قوم کو دکھایا جائے گا وہ لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ایک گوشت پوست والے مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا مگر وہ صلیب پر زندہ رہا۔زندہ قبر میں داخل ہوا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلا اور اس کے بعد وہ لوگوں سے چھپتا پھرا۔کیونکہ قانون اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور یہی اللہ تعالیٰ کی مخفی تدبیر تھی جس کے ماتحت وہ مجبور ہوئے کہ کشمیر اور افغانستان کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کریں۔خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ ان حالات کے نتیجہ میں مسیح اس ملک میں رہنا مناسب ہی نہیں سمجھے گا اور وہ خوشی سے ان قوموں کی طرف چلا جائے گا جن کی ہدایت اور اصلاح کے لئے اسے مبعوث کیا گیا ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اب فلسطین میں میرا رہنا مشکل ہے تو وہ مشرق کی طرف چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام بنی اسرائیل کے ان دس قبائل کو پہنچاتے رہے جو کشمیر اور افغانستان میں آبسے

تھے۔اس بحث کا اگلا حصہ بائبل سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ افغانستان اور کشمیر کی تاریخوں اور بعض پرانی قبائلی روایات وغیرہ سے اس کا تعلق ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ایک کتاب میں جس کا نام ''مسیح ہندوستان میں'' ہے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ واقعۂ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ ہجرت کر کے افغانستان اور کشمیر کی طرف آ گئے تھے۔اس کے علاوہ بعض اور تحقیقاتیں بھی ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کی طرف سے ایک نبی جسے شہزادہ نبی کہا جاتا تھا اور جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زخموں کے نشانات تھے ہجرت کر کے کشمیر میں آیا اور اس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا''

(ماخوذ از تفسیر کبیر تفسیر جلد ۵ سورہ مریم صفحہ ۱۲۱ تا ۱۱۵)

Najat

Muwazana Ma Bain Islam wa Masihiyyat

(Salavation

Comperison between Islam and Chirstianity)

Language:- urdu

Excerpts from Tafseer Kabeer of the Holy- Quran

By

Hadrat Mirzā Bashir-ud-din Mahmud Ahmad Khalifat-ul- Masih ii